مُحبّت بھی قیامت بھی

کرشن چندر

ناول

محبّت بھی قیامت بھی

کرشن چندر

ایشیا پبلشرز

اے۔۳۶، چیتک اپارٹ منٹ۔ پلاٹ نمبر ۲/۲۷ سیکٹر ۹ - روہنی، دہلی ۲۵

MOHABBAT BHI QAYAMAT BHI
Krishan Chander
Price : Rs. 80/-

مصنف : کرشن چندر
کتابت : اعجاز نبی
ناشر : اوپندر ناتھ
اشاعت : اکتوبر ۱۹۹۱ء
قیمت : ۸۰ روپے
تعداد : ۵۰۰

Printed at Photo Offset Printers, Ballimaran, Delhi - 110 006

Distributors:
STAR PUBLICATIONS,
Asaf Ali Road,
NEW DELHI - 110002.

ASIA PUBLISHERS
A-36, Chetak Appt.,
Plot No. 27/2,
Sector 9, Rohini,
DELHI-110085.

محبّت بھی قیامت بھی

●

ایشیا کے عظیم مُصنّف کرشن چندر ہمیشہ ان موضوعات پر قلم اٹھاتے ہیں جو نہ صرف مستقبل کی تابناک منزلوں کی نشان دہی کرتے ہیں بلکہ اپنے زمانے اور ماحول کی مکمّل تفسیر بھی کرتے ہیں۔ ان کے قلم میں کائنات کے دل کی دھڑکنیں سمٹ آتی ہیں اور ان کے جملوں کی نشتریت سے زندگی کی نہ جانے کتنی سوئی تلخ کہانیاں جاگ پڑتی ہیں۔

"محبت بھی، قیامت بھی" کرشن چندر کا ایک ایسا ہی عظیم شاہکار ہے۔ اس میں اِنسانی ذہن کی حالیہ تحقیقات کی روشنی میں ایک ایسی رُومان انگیز کہانی جنم لیتی ہے جو خواب و حقیقت کی نازک شاہراہوں سے گذرتی ہوئی حال اور ماضی کی ملی جلی سرحدوں تک پہونچتی ہے۔ اس کے علاوہ یہ ناول موجودہ معاشرے کی وہ تصویر بھی پیش کرتا ہے۔ جو دُور سے دیکھنے

ہیں یقیناً خوب صورت ہے لیکن قریب پہونچ کر جب اس کے صحیح خدوخال سامنے آتے ہیں تو انسان اس ماحول سے فرار حاصل کر کے سکون و اطمینان کی گود میں کچھ دیر کے لئے اپنی زندگی کی تھکن دُور کرنا چاہتا ہے۔

کرشن چندر کا یہ ناول بڑے فنکارانہ انداز میں اس ہمہ گیر مسئلہ کا جواب پیش کرتا ہے جو آج ساری دُنیا کے لئے ایک اہم سوال بنا ہوا ہے۔

●

۵

○

گاڑی جب بھنسارا جنکشن پر رُکی تو میری برتھ کے سامنے والی برتھ پر نیم دراز آدمی نے مجھ سے کہا ——— "بابو یہ کون سا اسٹیشن ہے۔؟"

حالانکہ وہ خود ذرا سا اٹھ کر اور کھڑکی کی طرف جُھک کر باہر پلیٹ فارم کے ایک کھمبے پر لگے ہوئے جنکشن کے بورڈ کو پڑھ کر معلوم کر سکتا تھا کہ کون سا اسٹیشن ہے۔ مگر وہ آدمی اسقدر موٹا تھا، اسقدر پھیلا ہوا بھدّا اور پلپلا تھا کہ اُسے ذرا سا اُٹھنے اور اٹھ کر گردن گھما کر کھڑکی کی طرف جھکنے میں اتنی ہی تکلیف ہوتی جتنی کسی تگڑے آدمی کو دو من کا بوجھ اٹھانے میں۔

لہٰذا اس نے مجھ سے کہا۔

راستہ بھر وہ مجھ سے خدمت لیتا آیا تھا۔ اور میں اس کی ڈیوٹی بجاتا آیا تھا۔ حالانکہ نہ میں اسے جانتا تھا نہ اس کے نام سے واقف تھا نہ دُور دُور تک میں کہیں اس کا رشتہ دار تھا۔ تو بھی اُسے آرام پہونچانا میں نے اپنا فرض سمجھا۔

کیونکہ وہ اسقدر موٹا آدمی تھا کہ یقین ہوتا تھا، وہ خود ٹرین تک چل کے نہ آیا ہوگا بلکہ کرین سے اٹھوا کر یہاں تک پہنچایا گیا ہوگا۔

اس کا رنگ بھینس کا سا تھا۔ اسی طرح بے ہنگم اور بھدّا تھا۔ آواز بھی ویسی ہی تھی۔ منہ مارنے اور چرنے کا ویسا ہی شوق رکھتا تھا۔ اور کھاتے ہوئے اسی طرح جگالی بھی کرتا تھا۔

مجھے اسے دیکھ کر سخت کراہیت کا احساس ہوتا تھا۔ اس پر بھی میں اس کی خدمت پر آمادہ کر دیا گیا تھا۔ تو محض اس کی مجبوری اور لاچاری دیکھ کر ذرا سا ہلنے سے، محض ایک بازو کی جنبش جو ایک تھر ماس کو اٹھانے میں درکار ہوتی ہے مجض اس ہلکی سی جنبش سے جس طرح اس کا سانس پھولنے لگتا تھا۔ اس سے مجھے سخت تکلیف ہوتی تھی۔ میں اس کی خدمت اس طرح کر رہا تھا۔ جیسے ایک ڈنگر ڈاکٹر کسی زخمی جانور کی خدمت کرتا ہے۔

میں نے اسٹیشن کی دیوار پر لکھے ہوئے پیلے حروف کو دیکھ کر کہا۔

"یہ بھنسارا جنکشن ہے۔!"

یہ نام سنتے ہی اس کی آنکھوں میں روشنی آگئی۔ چھوٹی چھوٹی چوہے کی سی آنکھیں بجلی کے بلب کی طرح چمکنے لگیں۔

بولا ـــــ "یہاں کے دہی بڑے بے حد مزے دار ہوتے ہیں۔ بابو مہربانی کر کے میرے لئے ایک روپے کے دہی بڑے لینا۔!"

اس نے بڑی مشکل سے جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک روپے کا نوٹ برآمد کیا۔

میں نے کہا ـــــ "دو روپے کے کیوں نہ لے لوں، بعد میں پھر مانگو گے۔!"

اب تک مجھے اس کے چٹورپن کا اندازہ ہو چکا تھا۔
میں اس کے چہرے کی کش مکش پڑھنے لگا۔ میری بات اسے پسند آئی تھی۔ لیکن دوسرا روپیہ نکالنے میں دشواری تھی۔ وہ اسی دشواری سے بچنا چاہتا تھا۔ دو روپیوں کے دہی بڑوں کی چاہت اور جیب سے دوسرا روپیہ نکالنے کی کوفت دونوں احساس اس کے چہرے پر دھوپ چھاؤں کی طرح کھلنے لگے۔
میں نے اس کی مشکل آسان کرتے ہوئے کہا۔ "بعد میں دوسرا روپیہ دیدینا۔ میں اپنے پاس سے لے آتا ہوں۔"
موٹے آدمی کے چہرے پر اطمینان اور سکون کے آثار نمودار ہونے لگے۔ مگر میرے ساتھ بیٹھے ہوئے فوجی کے چہرے پر غصّہ اور تناؤ کی کیفیت پیدا ہونے لگی۔ اس نے موٹے آدمی سے کہا۔
"دوسروں سے کام لیتے ہوئے تمہیں شرم نہیں آتی۔ اگر خود اپنا کام کرو تو شاید اتنے موٹے نہ رہو۔!"
"تم کو کیا ہے۔؟" وہ موٹا آدمی جز بز ہوکر بولا۔ "تم سے تو کوئی کام کو نہیں کہہ رہا ہوں۔ جس سے کہہ رہا ہوں وہ اگر خوشی سے کردیتا ہے تو اس سے تمہارا کیا بگڑتا ہے۔؟"
"مجھ سے کوئی کام کہہ کے تو دیکھو۔!" وہ فوجی برافروختہ ہوکر بولا۔
اس کے بعد اس نے خاموشی سے اپنی رائفل کے کندے کو ہاتھ لگایا۔ اور بولا۔ "تمہارے جیسے کام چوروں نے اس دیش کی حالت بگاڑ رکھی ہے۔ کام کریں گے نہیں۔ بس بیٹھ کے کھائیں گے اور دوسروں پر حکم چلائیں گے۔!"

موٹے آدمی نے اخبار منھ پر رکھ لیا۔

فوجی بولا ـــــ "ایسے ہی خدمت کرانے کا شوق ہے تو کسی نوکر اپنے ساتھ لائے ہوتے۔!"

موٹے آدمی نے اخبار منھ سے ہٹا کر کہا۔

"میری بیوی اگلے اسٹیشن سے سوار ہوگی۔!"

اتنا کہہ کر اس نے اخبار پھر منہ پر رکھ لیا۔

میں کوپے سے باہر نکل گیا۔ کوریڈور سے گزر کر بوگی سے باہر نکل کر دہی بڑے والے کے ٹھیلے تک بڑی مشکل سے پہونچا۔ وہاں بہت بھیڑ لگی تھی۔ مگر دو روپے کے دہی بڑے کی بات سن کر ٹھیلے والے نے بہت سے گاہکوں سے پہلے ایک کلھڑ میں دہی بڑے تھما کر دو روپے لے لئے۔ جب دہی بڑے والے سے رخصت ہوا تو کئی گاہک غصّہ سے میری طرف دیکھ رہے تھے، اتنے میں ریل نے سیٹی دی۔

گاڑی چلنے لگی۔ کسی نہ کسی طرح دوڑتا ہانپتا ہوا میں اپنی بوگی میں سوار ہو ہی گیا۔ واپس کوپے میں پہونچا تو فوجی کے ماتھے پر بدستور بل تھے۔ اور گہرے ہو گئے تھے۔ موٹا آدمی بے حد زور کر کے اور کسی حد تک میری مدد سے اٹھ کر اور ٹیک لگا کر بیٹھنے میں کامیاب ہوگیا۔ چند منٹ تک اس کا دم پھولتا رہا۔ لیکن جب تک اس کا دم پھولتا رہا برابر اس کی نگاہیں دہی بڑوں سے بھرے ہوئے کلّھڑ پر جمی رہیں۔

جب اس کے دم میں دم آیا، اس نے نگاہوں کے اشارے سے مجھے دونوں برتھ کے درمیان کھڑکی کے نیچے لگی میز سے کلّھڑ اٹھانے کو کہا۔

موٹے آدمی کے ہاتھ میں کلّھڑ دیکر میں فوجی کے قریب بیٹھ گیا۔ ہم دونوں ہی موٹے آدمی کو دہی بڑے کھاتے ہوئے دیکھنے لگے۔ کس انہماک سے وہ دہی بڑے کھانے میں جُٹا ہوا تھا۔ اب وہ نہ میری طرف دیکھ رہا تھا نہ فوجی کی طرف۔

فوجی نے مجھ سے پوچھا۔ "یہ تمہارا کوئی رشتہ دار ہے۔؟"

میں نے انکار میں سر ہلایا۔

"کوئی دوست۔!"

میں نے پھر انکار میں سر ہلایا۔!

"کوئی جان پہچان والا۔؟"

میں نے مسکرا کر فوجی سے کہا۔" اسی ٹرین میں اس سے ملاقات ہوئی۔!"

"تو پھر اس محنت سے اس کی خدمت کیوں کر رہے ہو۔؟"

"محض انسانیت کی خاطر۔!"

فوجی نے ایک دم بھڑک کر کہا۔" تو انسانیت کی خاطر میرے جوتوں پر پالش بھی کر دو۔"

فوجی نے پاؤں میری طرف بڑھایا۔

میں نے اس کے پاؤں کو زور سے ٹھوکر ماری۔

فوجی کا ہاتھ لپک کر قریب ہی کھڑی رائفل پر گیا۔

پیشتر اس کے کہ وہ اسے اٹھا لیتا۔ موٹے آدمی نے خالی کلّھڑ کی طرف دیکھ کر بڑی حیرت سے کہا۔

"یہ تو ــــ یہ تو ــــ بہت کم رہا۔"

بے اختیار مجھے ہنسی آگئی، فوجی بھی بے اختیار مسکرا دیا۔ اس کا ہاتھ رائفل سے اٹھ کر تہدیدی انداز میں موٹے آدمی کی طرف بڑھ گیا۔

"اتنا مت کھاؤ، مت کھاؤ۔!" فوجی کی انگلی موٹے آدمی کے پیٹ کی طرف اشارہ کرنے لگی۔ "پیٹ پھٹ جائیگا۔ مرجاؤ گے۔"

موٹا آدمی بولا۔ "میرا جسم تم دونوں کو ملاکر بھی تم دونوں سے چوگنا بڑا ہو گا۔ اس کو اتنی ہی خوراک چاہیئے۔!"

"اور ملک میں قحط ہے۔" میں نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

فوجی بولا۔ "اور اس کو دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ کیوں ہے۔؟"

فوجی نے مجھ سے کہا۔ "تمہارے جیسے دھرماتما لوگ ہی ان سیٹھوں کی عادتیں بگاڑ کے رکھ دیتے ہیں۔ اب اس موٹو کو دیکھو۔ انگلیوں میں قیمتی ہیروں کی تین انگوٹھیاں پہن رکھی ہیں۔ کوئی انگوٹھی بھی چالیس ہزار سے کم نہ ہوگی۔ مگر ایک نوکر ساتھ نہیں رکھیں گے۔"

سیٹھ بولا۔ "اگلے اسٹیشن پر میری بیوی آئے گی۔"

فوجی بولا۔ "وہ بھی تم سے کچھ کم نہ ہوگی۔ دس من کی لاش۔"

سیٹھ کا چہرہ غصّہ سے تپنے لگا۔ چوہے جیسی گھٹی گھٹی چمکتی آنکھیں۔ بجلی کی پیک بن گیئں۔ ہونٹ اندر کو بھنچ گئے۔

فوجی اسے سنانے کی خاطر بولا۔ "میں نے دیکھا ہے۔ کچھ عرصہ کے بعد موٹے آدمیوں کی بیویاں بھی اپنے شوہروں کی طرح موٹی گل گوتھیلی ہو جاتی ہیں۔"

سیٹھ کے ہونٹ کپکپانے لگے، مگر کچھ نہیں بولا۔ کیونکہ فوجی نے پھر اپنا

ہاتھ رائفل پر رکھ لیا تھا۔

میں نے فوجی سے کہا۔"غصّہ تھوک دو۔ اگلے اسٹیشن پر اس کی بیوی آرہی ہے۔ وہ اسے سنبھال لے گی۔۔!"

"مگر جب تک بھی یہ کوئی کام کہے مت کرو۔ اسے خود کرنے دو۔"

"ٹھیک ہے، اب ایسا ہی ہوگا۔" میں نے فوجی سے کہا اور پھر لہجہ بدل کر چند ثانیوں کے توقف کے بعد اس سے پوچھا۔"کہاں سے آرہے ہو۔؟"

"دو ماہ کی چھٹی پر گھر جارہا ہوں۔"

پھر اس نے مجھ سے پوچھا۔

"تم کہاں سے آرہے ہو۔؟"

میں نے کہا۔ "میں کلکتہ سے آرہا ہوں۔ ایک اخبار میں ایڈیٹر تھا۔ مگر اخبار بند ہو گیا۔"

"ہاں آجکل کلکتہ میں بڑی گڑبڑ ہے۔" فوجی بولا۔

"اجی گڑبڑ کا کیا پوچھتے ہو۔" وہ موٹا آدمی ہماری گفتگو میں دلچسپی لے کر بولا۔"میں خود کلکتہ سے بھاگ کر آرہا ہوں۔ نکسلیوں نے ناک میں دم کر دیا۔ میں نے خود کلکتہ کا سارا کاروبار ٹھپ کر دیا ہے۔ اب نئی فیکٹری میں بھوپال میں لگاؤنگا۔ کلکتہ میں تو جینا بھی مشکل ہے۔ ہمارے تو آٹھ دس بھائی بند کلکتہ سے ہمارے ساتھ نکل بھاگے۔ کوئی بمبئی گیا۔ تو کوئی مدراس، تو کوئی ٹراونکور، تو کوئی کانپور میں بھوپال جارہا ہوں۔ ذرا تھرماس سے پانی پلانا۔

موٹے آدمی نے میری طرف عاجزی سے دیکھ کر کہا۔

میں اٹھنے ہی والا تھا کہ فوجی نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے روک دیا۔
موٹے آدمی نے فوجی کا عندیہ سمجھ کر مجھ سے دوبارہ کچھ نہیں کہا۔ چند ثانیئے خاموش بیٹھا رہا۔ پھر اس نے اپنی پوری طاقت مجتمع کر کے قریب کی دیوار سے لٹکا ہوا تھرماس اتار لیا اور اسے کھول کر غٹاغٹ پانی پینے لگا۔
تھرماس آدھا خالی کر کے اس نے اسے دوبارہ بند کیا۔ اور اس خوف سے متاثر ہو کر کہ کہیں دوبارہ پیاس نہ لگے، اس نے تھرماس کو قریب اپنی سیٹ پر ہی رکھ لیا۔ اس ساری کاوش کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کی سانس دھونکنی کی طرح چلنے لگی۔ اور چہرہ پسینے میں ڈوب گیا۔ اس نے اپنے ہاتھ کی آستین سے منہ کا پسینہ پونچھا۔ پھر اخبار پڑھنے میں لگ گیا۔
کافی دیر تک کوپے میں سناٹا رہا۔ گاڑی کھٹاکھٹ کھٹاکھٹ کرتی ہوئی چلتی رہی۔ موٹے آدمی کو اخبار پڑھتے پڑھتے اونگھ آنے لگی۔ فوجی اس کی طرف غصے سے تاکتا رہا۔
موٹا آدمی بے بس ہو کر بولا۔ "مجھے نیند آ رہی ہے۔ مجھے برتھ پر لیٹ جانے دو۔"
"تو لیٹ جاؤ۔" فوجی بولا۔
"خود سے نہیں لیٹ سکتا۔ اس بابو کو بولو۔ میری مدد کرے۔"
"نہیں۔ یہ تمہاری مدد نہیں کر سکتا۔ تم خود اپنی کوشش سے اپنی برتھ پر لیٹ جاؤ۔"
موٹے آدمی نے اپنے ارد گرد پھیلے ہوئے گوشت کی تہوں کو دیکھا۔ پھر

لیٹنے کی کوشش کو اپنے لئے ناممکن سمجھ کر بیٹھے بیٹھے اونگھنے لگا۔

مجھے اس پر ترس آنے لگا۔ مگر فوجی کا ہاتھ میرے کندھے پر بڑی مضبوطی سے رکھا ہوا تھا۔

میں موٹے آدمی سے نگاہیں پھیر کر باہر کھڑکی سے دیکھنے لگا۔

کوئی اسٹیشن قریب آرہا تھا۔ آؤٹر سگنل گزر گئے۔ گاڑی کی رفتار دھیمی ہوتی گئی۔ گاڑی اسٹیشن کے وارڈ میں داخل ہو رہی تھی۔ پھر اسٹیشن کا پہلا وارڈ نگاہوں سے گزر گیا۔

"منگل کٹھا" اس اسٹیشن کا نام تھا۔ سنگِ مرمر کی بڑی بڑی سلیں اور تختے لکڑی کی شہتیروں کی طرح ایک دوسرے پر چُنے ہوئے تھے۔

گاڑی رک گئی۔

شور، حرکت، گھما گھمی، آوازیں ایک دوسرے سے لڑتی ہوئیں۔

چند منٹ کے بعد دو قلی سامان اٹھائے ہوئے ہمارے کوپے کے سامنے رک گئے۔ ان کے ساتھ ایک دس بارہ برس کا لڑکا بھی تھا۔

"آؤ۔ آؤ۔ کمل۔" ہمارے کوپے کے سیٹھ نے اسے اشارہ کر کے کہا۔

"میں یہاں ہوں اس کوپے میں۔"

پھر چند ثانیوں کے بعد اس کوپے میں ہڑبونگ سی مچ گئی۔ کمل اپنے چاچا جی کے پاؤں چھو رہا تھا۔ اور قلی کوپے میں سامان رکھ رہے تھے۔ اور ہم لوگ اچانک حیرت زدہ ہو کر ایک نازک اندام جوہی کی کلی کی طرح سفید رنگت والی بڑی بڑی آنکھوں والی، دھانی ساڑی پہنے ہوئے ایک نوجوان

عورت کو دیکھ رہے تھے جو سیٹھ کے قدموں پر جھکی جارہی تھی۔ اس کا نازک شانہ سیٹھ کے بھاری بھرکم ہاتھ کے بوجھ سے لچک لچک گیا۔

"ٹھیک تو ہو سگندھی۔؟" سیٹھ خوشی سے منمنایا۔

کچھ پتہ نہیں چلا۔ کب قلی گئے۔ کب وہ دس بارہ سال کا لڑکا رخصت ہوا۔ کب گاڑی چلی۔ بس اتنا محسوس ہوا کہ گاڑی کب کی اسٹیشن سے نکل چکی تھی۔ اور ہمارے سامنے سیٹھ کے پاؤں کے قریب وہ خوبصورت عورت کھڑی تھی۔ بوٹا سا قد، ماتھے پر جھومر، سر پر پلّو، شرم وحیا کی تصویر مگر کتنی خوب صورت ایسی خوب صورتی دیکھنے سے، دیکھنے کی بھوک اور بڑھتی ہے۔

میں اور فوجی دونوں اس عورت کی طرف ٹکٹکی لگائے دیکھ رہے تھے۔

تو یہ تھی سیٹھ کی بیوی۔

سیٹھ نے اپنے پاؤں کی طرف اشارہ کرکے کہا۔ "بیٹھ جاؤ سگندھی۔!"

سگندھی نے سامان کا جائزہ لیا۔ تھرماس کو قرینے سے لٹکا دیا۔ ناشتہ دان کو میز کے نیچے ہتھی کے سہارے سے لٹکا دیا۔ اوپر کی سیٹ کی طرف مڑ کر اوپر رکھے ہوئے سامان کو سلیقے اور قرینے سے ٹھیک کرنے لگی اور نظر آئیں اس کے ہاتھوں میں پھول کی طرح کھلنے والی انگلیاں، اس کی کمر کا خم اور کولہوں کے لوچ پھر ایک دم پلٹ کر اس نے ساڑی برابر کی جیسے اسے اس بات کا احساس ہو کہ دو غیر آدمی اس کے حسن سے متاثر ہو کر اسے متواتر گھورے جا رہے ہیں۔

پھر وہ سمٹ کر اپنے شوہر کے قدموں میں بیٹھ گئی۔ سیندور کا ایک بڑا

سا ٹیکہ اس کے ماتھے پر دمک رہا تھا۔

"سگندھی۔!" سیٹھ نے تھکے ہوئے لہجہ میں اپنی بیوی کو پکارا۔ "مجھے اس برتھ پر لٹا دو۔"

پیشتر اس کے کہ سگندھی اپنی جگہ سے اٹھتی، میرے اور فوجی کے ہاتھ سیٹھ کی بغل میں آچکے تھے اور ہم دونوں کوشش کرتے ہوئے سیٹھ کو بڑی احتیاط سے اس کی برتھ پر لٹا رہے تھے۔

●
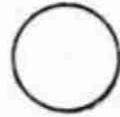
"کسے معلوم تھا، اس بھدّے سیٹھ کی بیوی اتنی خوب صورت ہوگی۔!" فوجی نے کہا۔ اس کا اشارہ کھلے طور پر ہمارے کوپے میں لیٹے ہوئے موٹے سیٹھ اور اس کی نوجوان بیوی کی طرف تھا۔ میں اور فوجی دونوں اپنے کوپے سے نکل کر باہر کوریڈور کے ایک کونے میں سگریٹ پی رہے تھے اور باتیں کر رہے تھے۔ سیٹھ کو اس کی برتھ پر لٹا دیا گیا تھا۔ سیٹھانی کے لئے فوجی نے نچلی برتھ خالی کر دی تھی تاکہ رات کو اس خوب صورت عورت کو بار بار اوپر نیچے آنے جانے کے لئے اٹھنا چڑھنا نہ پڑے۔ دو تھرماس پانی سے بھروا کر سیٹھ کے قریب رکھ دیئے گئے تھے۔ اور کنٹین سے گرم گرم تازہ کھانا دونوں میاں بیوی کے لئے منگوا دیا گیا تھا۔ اور ایرکنڈیشنڈ کلاس کے اٹنڈنٹ کی خوشامد کر کے دو تکئے سیٹھ اور سیٹھانی کے لئے منگوا دیئے گئے تھے۔

باہر چاندنی غضب کی تھی اور دھندلے اشجار اور دھندلے کھیت اور

کوئی گھروں میں کہیں کہیں کوئی دیا ٹمٹماتا ہوا کسی موہوم امید کی طرح دل میں روشنی کرتا ہوا گزر جاتا تھا۔

ہم دونوں بہت عرصہ سے گفتگو کر رہے تھے۔ فوجی نے اپنا نام رونق سنگھ بتایا تھا۔ کل صبح نو بجے وہ شہد پارہ نام کے اسٹیشن پر اُتر جائیگا۔ وہ شادی کرنے جا رہا تھا۔ دو مہینے اپنی بیوی کے ساتھ رہے گا۔ اس نے سنا ہے کہ ساوتری اس کی ہونیوالی بیوی خوب صورت ہے۔ اس سیٹھانی کی طرح تو شاید خوب صورت نہ ہو۔ اس عورت کو تو بھگوان نے اپنے ہاتھ سے بنایا ہے۔

"مگر بنا کر کس کے ہاتھ میں دیدیا ہے۔" میں نے کہا۔ "اس کی بدقسمتی تو دیکھو۔"

"مگر اپنی بدقسمتی کا اسے بالکل احساس نہیں ہے۔ فوجی بولا۔" ایسی ہوتی ہیں ہماری ہندوستانی عورتیں، شرم و حیا کی پتلیاں۔ وہ شوہر کا جسم نہیں دیکھتی ہیں۔ ان کے نام پر زندہ رہتی ہیں۔ تم نے دیکھا نہیں۔ وہ عورت کس طرح اپنے سیٹھ پر نچھاور ہو رہی تھی۔ کس طرح اس کی خدمت میں سچی لگن سے کام کر رہی تھی۔ ایسی ہوتی ہیں ہمارے دیش کی عورتیں۔!"

میں نے کہا۔ "اس وقت وہ دونوں کوپے میں کیا کر رہے ہوں گے۔؟"

رونق سنگھ ہنس کر بولا۔ "ہاں یہ ایک بڑی مشکل ہے۔ میرا خیال ہے سیٹھ تو سو گیا ہوگا۔ وہ تو ہمارے سامنے ہی خراٹے لینے لگا تھا۔"

"اور وہ کامنی سی مورت۔؟" میں نے پوچھا۔

رونق سنگھ کے منہ سے بے اختیار ایک آہ نکل گئی۔ ایک دبی دبی سی آہ۔ آہستہ سے بولا۔ "شائد وہ بھی سو گئی ہوگی۔"

"کیا تمہارا دل نہیں چاہتا کہ ــــ کہ ــــ" میں نے اس کی طرف دیکھ کر فقرہ ناتمام چھوڑ دیا۔ میری آنکھوں میں شرارت تھی۔

وہ مسکرایا۔ میرے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ "اگر کوئی اور زمانہ ہوتا۔ اگر میری شادی نہ ہونے کو ہوتی تو شاید میں تمہارے سیٹھ کے سامنے اس کی سیٹھانی کا اغوا کر کے لے جاتا۔ مگر اب تو میں خود شادی کرنے جارہا ہوں۔ کسی کے گھر میں ڈھولک بج رہی ہوگی۔ کسی نے میرے نام پر بالوں میں خوشبو لگائی ہوگی۔ جانے وہ کیسی ہوگی۔؟"

رونق سنگھ بولتے بولتے چپ ہوگیا اور مجھے ایسا لگا جیسے وہ اس وقت یہاں نہیں ہے۔ چلتی گاڑی سے چھلانگ لگا کر چاندنی میں نہائے ہوئے کھیتوں اور ٹیلوں کو پھلانگ کر وہ شاید کہیں اور اپنی ساوتری کے گاؤں کو نکل گیا تھا۔ صرف اس کا جسم میرے سامنے کھڑا تھا۔ مگر اس کے اندر کی بے قرار روح کہیں دُور ــــ بہت دُور جاچکی تھی۔

اور مجھے کلکتہ کی مے فیئر کی کافی بار میں اپنے کٹے ہوئے بالوں کو بار بار جھٹکانے والی آبھا مکرجی یاد آئی۔ جو میری طرح "کلکتہ سن" میں ملازم تھی۔ فرق صرف اتنا تھا کہ میں ایڈیٹر تھا اور وہ میری اسسٹنٹ ایڈیٹر۔ یہ ہماری آخری ملاقات تھی کیونکہ "کلکتہ سن" بند ہوگیا تھا۔ اور میں کلکتہ چھوڑ کر جارہا تھا۔

مے فیئر بار کے نیم اندھیروں میں، میں آبھا کا چہرہ دیکھ رہا تھا۔ سانولی سے ذرا کھلتی ہوئی رنگت۔ تنگ دہانہ اور ہونٹ ذرا ذرا سے کھلے ہوئے، جیسے کسی بوسے کیلئے بیقرار اور آنکھیں حیران حیران سی۔ پھر یکایک پھلجھڑی کی طرح لمبی ہنسی۔ جو

آس پاس بیٹھے ہوئے لوگوں کو بھی چونکا دے اور دوسری میزوں پر بیٹھے ہوئے جوڑے ہماری طرف دیکھنے لگ جاتے، پھر خاموشی اور ایک نامعلوم گہری اداسی ــــــ جیسے آبھا کے سینے پر کسی گہرے غم کا دباؤ دھیرے دھیرے بڑھتا ہوا۔ اور ایک گھونٹ کافی کے بعد کا جو کا ایک دانہ، جیسے کوئی اتھاہ جھیل میں کنکر پھینک دے۔ کب سے آبھا کنکر پھینک رہی تھی۔ میری طرف اور میں اس کے ہونٹوں کے ساحل کے قریب کھڑا اس کے غم سے متاثر تھا۔

"تم کیوں جا رہے ہو۔؟" آبھا نے پانچویں بار پوچھا۔

میں نے پانچویں بار کہا۔

"کیونکہ جس شاخ پر آشیانہ تھا وہ ٹوٹ چکی ہے۔" کلکتہ سن" بند ہو گیا۔ میں کلکتہ میں رہ کر کیا کروں۔؟"

"کیا کلکتہ میں سَن کے علاوہ تمہاری اور کوئی دلچسپی نہیں ہے۔؟" آبھا نے اٹھلا کر پوچھا۔

آبھا کی آواز پتلی اور کٹیلی نہ تھی، گہری اور گداز تھی۔ لگتا تھا اس کی آواز کی انگلیاں میرے چہرے کو چھو کر، آہستہ آہستہ چھو کر مجھے ایک مخملیں لمس کا احساس دیئے جا رہی ہیں۔ دھیرے دھیرے کسی گہرے جھرنے کی طرح بہنے والی آواز آبھا کی آواز مجھے پسند ہے۔ لگتا ہے سوز و ساز کی کئی گہری پرتیں اس آواز میں کھل رہی ہیں۔

"نہیں ــــــ ایسا تو نہیں ہے۔" میں نے اس سے کہا۔" کلکتہ میں ایک لڑکی رہتی ہے۔ اس میں مجھے دلچسپی ہے۔ اور شائد اسے بھی ہو۔!"

"پھر ـــــ" آبھا کے ہونٹ تھوڑے سے اور کھلے۔

"مشکل یہ ہے کہ وہ لڑکی مجھ سے شادی نہیں کریگی۔"

آبھا نے ایک قاطع حرکت سے اپنے بال جھلائے۔ بولی۔

"وہ لڑکی شادی کو ایک ڈھونگ سمجھتی ہے۔"

"اور ساتھ رہنے میں یہ برائی ہے کہ کسی دن وہ لڑکی مجھ سے اوب کر بھاگ جائے۔"

میں نے کہا۔ "اسے بھاگنا ہوگا تو شادی سے پہلے بھاگے گا۔"

ہمارے آس پاس کی میزوں سے دو جوڑے اٹھ کر چلے گئے۔ باہر کا دروازہ ذرا سا کھلا۔ دوپہر کی جھلملاتی دھوپ چند لمحوں کے لئے ہم تک آئی۔ پھر ہم سے تیر کے نیم اندھیرے اور اس کی خنک فضا میں کھو گئی۔

آبھا ذرا سا آگے بڑھ کر اپنے ہاتھ سے میرے ہاتھ کو پکڑ کر بولی۔

"ہم یہاں کیوں نہیں رہ سکتے۔ سات سال تک تم کلکتہ سن کے ایڈیٹر رہے ہو۔ پانچسال تک میں اسسٹنٹ ایڈیٹر رہی ہوں۔ ہم لوگ دونوں مل کر ایک رسالہ کیوں نہ نکالیں۔ اکٹھے رہیں۔ اکٹھے کام کریں۔"

"اور اکٹھے تباہ ہو جائیں۔" میں نے اس سے کہا۔

"تم ہر بات کو منفی رنگ میں لیتے ہو۔" آبھا نے شکایت بھرے لہجہ میں مجھ سے کہا۔

"آجکل کلکتہ پر منفی رنگ غالب ہے۔ اسی لئے میں بھی اسی رنگ میں بات کرتا ہوں۔ شخصی توڑ پھوڑ پائپ کی بندوقیں، ٹیگور سے انکار ـــــ

توڑ پھوڑ

انقلاب تو عوام کی انگوٹھی میں ہیرے کے نگ کی طرح جڑا ہوتا ہے۔ وہ عوام سے دس میل آگے جا کر بھاگنے سے حاصل نہیں ہوتا۔ اچھا ڈارلنگ۔!"

"مگر وہ نوجوان کتنے سچّے اور بہادر ہیں، یہ تو مانو گے۔!"

"مانتا ہوں۔!"

"ان کے دل میں تبدیلی کی جو الا دہک رہی ہے۔ تو کیا وہ چپ چاپ بیٹھے رہیں۔ ناانصافی کے سامنے سر جھکا دیں۔ طاقتور لوگوں کی لوٹ کھسوٹ کو ایک آرے کی طرح اپنے سینے پر چلنے دیں۔؟ ظلم کی تلوار کو نیام سے نکلتے دیکھ کر کلکتہ سے بھاگ جائیں۔"

"تم نے مجھے غلط سمجھا ہے اچھا م۔ کبھی کبھی دیئے کو اپنے چھپّر کے بہت نزدیک رکھ دینے سے اپنے ہی گھر میں آگ لگ جاتی ہے۔ کبھی کبھی کوئی غلط تدبیر خلوص اور سچ کے سینے میں تلوار کی طرح اُتر جاتی ہے۔ لوگوں کو ساتھ لئے بغیر آج تک کوئی انقلاب کی کوشش کامیاب نہیں ہوئی۔"

"یہ غلط ہے۔ ہم کوشش کرتے جاتے ہیں۔ کامیاب ہوں یا ناکام۔ اس کا فیصلہ اپنے ہاتھ نہیں ہے مگر کوشش فرض ہے۔ اگر ۱۹۰۵ء کا انقلاب نہ ہوتا تو ۱۹۱۵ء کا انقلاب کیسے آتا۔؟"

"مگر وہ انقلاب تو ہو۔!"

"تم بزدل اور بھگوڑے ہو۔!"

میں چُپ رہا۔

"تم نے پھر کس لئے اپنے گھر میں انقلابیوں کو پناہ دی۔ مہینوں تم نے

نکسلیوں کو اپنے گھر میں چھپا کر رکھا۔ اور پولیس نے تم پر کبھی شُبہ نہ کیا کیونکہ تم نے ہمیشہ 'سن' میں نکسلیوں کی کاوشوں کا مذاق اڑایا۔ میں سمجھتی تھی تم دل سے ہمارے ساتھ ہو۔"

"میں دل سے تمہارے ساتھ ہوں۔" میں اس کے قریب جھک کر اس کے بالوں سے کھیلنے لگا۔

اس وقت مے فیئر میں کوئی نہ تھا۔ کرسیاں میزیں خالی پڑی تھیں۔ دو ویٹر ایک کونے میں اونگھ رہے تھے۔ کاؤنٹر پر کلرک پنسل کا ایک سرا منہ میں لئے بلوں کی رسید بک پر جھکا ہوا تھا۔

"پھر تم کیوں جا رہے ہو۔؟" آبھا نے رندھے ہوئے گلے سے پوچھا۔

"مجھے یہ شہر پسند نہیں۔ مجھے کوئی شہر پسند نہیں۔ میں یہاں سے جا رہا ہوں۔ میں ہر شہر سے جا رہا ہوں۔ میں اخباروں سے دُور بھاگنا چاہتا ہوں۔ اگلے دس سال تک میں کوئی اخبار نہیں پڑھونگا۔ سب لفظ بیکار اور ساری خبریں پرانی ہیں۔ میں کسی گاؤں میں جا کر رہونگا۔ اور کھیتی باڑی کرونگا یا کسی غار میں جا کر ایک بھالو کی طرح رہونگا۔ اور کسی شہد کی طرح میٹھی دیہاتن کو اغوا کر لوں گا۔ مجھے اس مے فیئر سے ٹھنڈی کافی کے گلاس سے، ایرکنڈیشنڈ کمرے کی نقلی خنکی سے نفرت ہو چلی ہے۔ میں ایک کھلے آسمان کے نیچے پیڑوں بھری زندگی میں رہنا چاہتا ہوں جہاں آنکھ کھلے تو اصلی ہوا ملے۔ پنکھے کی ہوا نہ ملے۔ زمین پر چلوں تو کھیتوں کی بھربھری مٹی میرے تلوے سہلائے غالیچے کا مخملیں لمس نہیں اور جب رات ہو تو آنگن کے چولہے میں جلتے ہوئے

الاؤکی روشنی میں کسی کے جھکے ہوئے چہرے پر دبی دبی محبّت کا پرتو دیکھوں۔ فلم زدہ محبّت کی نقلی شاعری نہیں۔"

یکایک ایک زور کا چانٹا میرے گال پر پڑا۔

دیوار سے لگے لگے اونگھتے ہوئے ویٹر یکایک جاگ گئے اور کاؤنٹر پر کھڑا ہوا کلرک بھی چونک کر ہماری طرف دیکھنے لگا۔ پھر پنسل منہ میں لیکر چبانے لگا۔

آبھا میز پر سر ٹیک کر رونے لگی۔

وہ دیر تک سسکیاں لیتی رہی۔ دیر تک میں اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتا رہا۔ دیر تک کافی کا گلاس ٹھنڈا ہوتا رہا۔ دیر تک میں سوچتا رہا۔ یہ کس طرح کی محبّت ہے۔ جذبے نہیں ملتے، فکر نہیں ملتی، پھر بھی کشش کی ایک ڈوری ہے جو ایک کی رُوح سے دوسرے کی رُوح تک پنہاں ہے۔

آبھا یکایک میز سے اٹھ کر باتھ روم میں چلی گئی۔ جب واپس آئی تو اس کی آنکھیں خشک تھیں۔ اور چہرہ نئے میک اَپ سے آراستہ۔ اپنی کتنی ہی ناآسودگیوں کو عورت ایک نئے میک اپ سے چھپا لیتی ہے۔ مرد کو ہزار جھوٹ بولنے پڑتے ہیں۔

واپس آکر وہ میز پر کھڑی رہ گئی۔ بڑے سپاٹ لہجہ میں اس نے مجھ سے پوچھا۔

"تو تم میرے ساتھ نہیں رہو گے۔"

"اگر شادی کر دگی تو رہوں گا، مگر کلکتہ میں نہیں۔"

"شادی ناممکن ہے۔ مجھے اپنی آزادی بہت پیاری ہے اور مجھے کلکتہ

بھی بہت پسند ہے۔ تمہیں کلکتہ ہی میں رہنا پڑیگا۔ تمہیں شہر اس قدر ناپسند کیوں ہیں۔ انسان نے ساری ترقی شہر بسا کر ہی کی ہے۔ سائنس، کلچر، ادب اور معاشیات، تہذیب، سماجیات سب کا دامن شہر سے بندھا ہوا ہے۔ میں مانتی ہوں قدرت کے حسن میں بڑی دلفریبی ہے۔ مگر انسان کا حسن قدرت کے حسن پر اضافہ ہے۔ قدرت نے خوب صورت جنگل بنائے۔ انسان نے تاج محل قدرت نے چلتے پانی کی موسیقی دی۔ انسان نے تان سین کی راگنی۔ قدرت نے ہوا میں پھلانگتے ہوئے ہرن کی قلانچ۔ انسان نے جیٹ ہوائی جہاز۔ قدرت نے بھوج پتر دیا۔ انسان نے اس پر کالی داس کی شکنتلا لکھی۔ شہر سے بھاگ کر تم پھر جنگلی بننا چاہتے ہو۔ ؟"

"ہاں۔ !"

"کیوں۔ ؟"

"اس لئے کہ میں شہروں کے ظلم وستم سے عاجز ہوں۔ مجھ کو اب کنوارے پہاڑوں کی ہوا چاہیئے۔ کسی کی نگاہ کی طرح افق پر کوندتی ہوئی بجلی تمہارے بالوں کی طرح گھنیری گھٹاٹوپ بدلیاں۔ یاد ہے جب دارجلنگ میں ہم دونوں کے سامنے یکایک بادل ہٹ گئے تھے۔ دھیرے سے اسٹیج کے پردوں کی طرح سرک گئے تھے۔ اور ان کے بیچ کنچن جنگا کا چہرہ یوں ابھر آیا تھا جیسے کوئی نئی دلہن اپنے چہرے سے گھونگھٹ سرکا دے۔ یہ تو صحیح ہے کہ شہروں نے قدرت کے حسن میں اضافہ کیا ہے لیکن حسین عورتوں نے بھی اپنی اداؤں کا ہر انداز قدرت سے ہی سیکھا ہے۔ !"

"توتم کیا چاہتے ہو۔؟"

میں نے اپنا چہرہ اس کے بالوں میں چھپالیا۔ اور نہ صرف اس کے بالوں میں لگی ہوئی خوشبو بلکہ اس کے جسم کی خوشبو بھی میرے اِردگرد لپٹنے لگی۔ مگر میں نے اپنے ہوش وحواس مجتمع کرتے ہوئے اس سے کہا۔

"مجھے جانے دو۔ اس وقت جانے دو۔ ممکن ہے میں کبھی واپس آجاؤں۔ مگراس وقت مجھے جانے دو۔"

اس کے نیم وا ہونٹوں میں دانت جوہی کے غنچے کی طرح چمک اٹھے۔ اور اندھیرے میں بہنے والے جھرنے کی طرح اس کی پتلیاں بھیگ گئیں۔ ایک دبی دبی سی آہ اس کے سینے سے نکلی۔ یکایک اس نے اپنا ہاتھ بلاوز میں ڈال کر ایک پُرزہ نکالا اور اسے میرے سامنے میز پر پھینک کر چلی گئی۔

"میں نے پُرزہ کھولا۔ خط نہ تھا۔ اس کی نئی انگریزی نظم تھی۔

"جو قدم اٹھتا ہے۔
سمجھتا ہے ہوا میں ہے۔
وہیں سکون ہے۔
میں دھرتی ہوں۔
کشش۔
دامن۔
مرکز۔
مدار۔

پھر لوٹ کے آؤ گے اڑنے والے۔
کیونکہ میں دھرتی ہوں۔"

ے فیئر کا دروازہ کھلا اور بند ہو گیا۔ میں نے چونک کر فوجی کی طرف دیکھا۔

وہ ابھی کہیں باہر تھا کسی شہنائی کی آواز پر دوڑا جا رہا تھا۔ ریل گاڑی سے تیز، پر میں نے اپنے سگریٹ کی طرف دیکھا۔ وہ میری آشاؤں کی طرح بجھ چکا تھا۔

میں نے سوچا۔ فوجی شہنائی کی آواز پر دوڑا جا رہا ہے اور میں اس آواز سے دُور جا رہا ہوں۔ آبادی سے پرے کسی جنگل کی تلاش میں۔ آدمی شہر سے تو بچ سکتا ہے لیکن کیا وہ عورت سے بھی بچ سکتا ہے۔

میں کھڑا سوچتا رہ گیا۔ کوریڈور کے شیشوں پر آبھا کا چہرہ اُبھرتا گیا۔ اور گاڑی کی رفتار تیز ہوتی گئی۔

●

○

آدھی رات کا وقت ہو گا۔ سیٹھ خوابِ غفلت میں تھا۔ اوپر کی سیٹ پر فوجی کی سانس دھیرے دھیرے آرام سے چل رہی تھی۔ لگتا تھا گہری نیند میں ہے مگر مجھے نیند نہیں آ رہی تھی۔

میں نے دیکھا کہ خوب صورت سیٹھانی دھیرے سے اپنے برتھ سے اٹھی۔ کھڑکی سے زبردستی چاندنی میں اس کا شفّاف بدن، شب خوابی کے کپڑوں سے چھن گیا۔

میرے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔

وہ ایک لوٹا لے کر باہر نکل گئی۔

سب سو رہے تھے۔

میں جاگ رہا تھا۔

دس منٹ گزر گئے۔ پندرہ منٹ گزر گئے۔ آدھ گھنٹہ گزر گیا۔ اتنی دیر

وہ کہاں کیا کر رہی ہے۔؟

جب پون گھنٹہ گزر گیا تو میں دھیرے سے سانس روکتا ہوا اپنی اوپر کی برتھ سے نیچے اُترا اور خاموش قدموں سے باہر کوریڈور میں جا پہونچا۔ دونوں طرف نظر دوڑائی کہیں پر کوئی نہ تھا۔ سب کمرے اندر سے بند تھے۔

کوریڈور کے آخر میں دونوں طرف باتھ روم تھے۔ یکایک مجھے ایک باتھ روم پر زور زور سے تھپ تھپانے کی آواز آئی۔

میں بے آواز قدموں سے تیز چلتا ہوا اس باتھ روم تک جا پہونچا۔ ایک نسوانی آواز گھبرائی ہوئی ٹائیلٹ کا دروازہ تھپ تھپاتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ "مجھے باہر نکالو۔ باہر نکالو۔!"

میں نے کہا۔ "اندر کا کھٹکا کھول کر باہر آجاؤ۔"

"وہ نہیں کھلتا آدھے گھنٹے سے کوشش کر رہی ہوں۔!"

میں نے آواز پہچان لی۔ وہی الپسرا تھی۔

میں نے ٹائیلٹ کے دروازے کی طرف غور سے دیکھا۔ عین بیچ میں کردمیم کی چمکتی موٹھ تھی جو دائیں بائیں دونوں طرف گھومتی تھی۔ بائیں طرف گھمانے سے دروازہ کھلتا تھا۔ دائیں طرف گھمانے سے دروازہ اندر سے بند ہو جاتا تھا۔ میں نے غور سے دیکھا۔ موٹھ بائیں طرف ذرا گھوم کر جام ہو گئی تھی۔ اور دندانے زنگ آلود تھے۔ اس لئے حرکت نہ کر رہے تھے۔

میں نے کہا۔ "تھپ تھپانا چھوڑ دو۔ میں چند منٹ میں تمہیں باہر نکالے لیتا ہوں۔"

اس نے اندر سے تھپ تھپانا بند کر دیا۔

میں نے جیب سے چاقو نکال کر دندانوں کو زنگ سے صاف کیا۔ اس کے بعد جوں ہی بائیں طرف پیچ گھمایا تو دروازہ کھٹ سے کھل گیا۔

سیٹھانی باہر نکل کر میری بانہوں میں بیہوش ہو گئی۔

اس کا سارا بدن پسینے میں بھیگا ہوا تھا۔ اور پتلی ساڑی جا بجا بدن پر چپکی ہوئی تھی۔ میں اسے بانہوں میں اٹھا کر دوسرے ٹائیلٹ میں لے گیا۔ پہلے ٹائیلٹ میں اس لئے نہیں لے گیا کہ کہیں اگر پھر سے دروازہ بند ہو گیا تو ہم دونوں کا کیا حشر ہو گا۔؟

دوسرے ٹائیلٹ میں اس کے چہرے پر پانی کی دھاریں پھینک پھینک کر اسے ہوش میں لایا۔

یکایک اس کی بڑی بڑی آنکھیں یوں کھلیں جیسے سطح آب پر کنول کھل جائیں۔

وہ کمزور آواز میں بولی۔ "میں تو سمجھتی تھی کہ آج ساری رات ٹائیلٹ میں بند رہوں گی۔!"

میں نے کہا۔۔۔ "میں نے تمہیں ٹائیلٹ میں جاتے دیکھا تھا۔ جب دیر تک تم نہ آئیں تو باہر کاریڈور میں آ گیا۔"

"میں تو چلاتے چلاتے مر جاتی۔ کب سے دروازہ پیٹ رہی تھی۔!"

یکایک وہ خاموش ہو گئی۔ اس نے پھر اپنی آنکھیں بند کر لیں اور میرے بازوؤں کے گھیرے سے نکلنے کی کوشش کی۔

میں اس کے چہرے پر جھک گیا اور میرے تپتے ہونٹ، خشک ہونٹ اس کے گیلے ہونٹوں سے مل گئے۔ وہ ہونٹ بالکل نرم بالائی تھے۔ لکھنؤ کی نمش ——— وہ دیر تک میرے بوسے میں گھلتی رہی اور اس کا سارا بدن کانپ کانپ کر مجھ سے زور سے چمٹ گیا جیسے وہ صدیوں کی بھوکی تھی۔

اس کے بالوں کی ایک لٹ بھیگ کر اس کے رخسار سے آلگی تھی، میں نے اس لٹ سے کھیلتے ہوئے کہا۔

"کیا تمہیں معلوم نہیں تھا۔ تم کس جانور سے شادی کر رہی ہو۔!"

"مجھے معلوم تو تھا۔!"

"تو پھر کیوں۔؟"

اس نے ایک لمبی آہ بھری۔ پھر اس نے اپنا چہرہ اوپر اٹھا کے میری ٹھوڑی کو چوم لیا۔

بولی۔ "یہ مت پوچھو۔ مجھ سے پیار کرو۔!"

میں نے کہا۔ "میں تو پوچھوں گا۔"

وہ بولی ——— "ہم سات بھائی بہن ہیں۔ باپ اندھا ہے، ماں بوڑھی ہے سب سے بڑا بھائی انجینئرنگ کر رہا ہے۔ اس سے چھوٹا بھائی ڈاکٹری کا کورس کر رہا ہے۔ اس سے چھوٹا ٹیلی ویژن کا کورس کر رہا ہے۔ مجھ سے چھوٹی بہن کی شادی ہو گئی۔ دو چھوٹی بہنوں کی شادی ہونے کو ہے۔ سارا خرچ سیٹھ ہی اٹھاتا ہے۔ ایک ایک پائی۔"

میں نے سوچا۔ اس عورت کی وفا کتنی نازک لیکن مضبوط ڈوریوں سے

سیٹھ کے موٹے بدن سے چپکی ہوئی ہے۔

"تمہیں کراہیت نہیں آتی۔؟"

"آتی ہے مگر اس کا پریوار کون سنبھالے گا۔؟"

"کوئی بچّہ بھی ہے۔؟"

"نہیں۔ سیٹھ نامرد ہے۔"

"تو پھر بچّہ نہیں ہوگا۔؟"

"نہیں بچّہ تو ہوگا۔"

"کیسے۔؟"

"ہم لوگ بھوپال جا رہے ہیں۔ نئی بزنس کھولنے کے لئے۔ بھوپال سے بیس میل دور باداگوری سہائے کی سمادھی ہے۔ سنا ہے وہاں کا باوا رنگی رام بہت پہونچا ہوا ہے۔ اس کے آشیرواد سے بچّہ ہو جائے گا۔!"

میں نے کہا۔ "ہاں کئی سادھو بچّہ پیدا کرانے کے ماہر ہوتے ہیں۔"

"اب جو کچھ ہوگا سو ہوگا۔" خوب صورت سیٹھانی بولی۔ "ان کو بچّہ چاہیئے۔ بچّہ مل جائیگا ان کو۔!"

"مگر وہ سیٹھ کا بچّہ نہ ہوگا۔"

"کہلائے گا تو اسی کا۔" وہ کڑوے لہجہ میں بولی۔

میں نے کہا۔ "یہ تمہارے بدن سے کیسی اچھّی خوشبو آرہی ہے۔ جوہی کی۔"

وہ بولی ——— "ہاں پیدا ہونے کے وقت ہی سے میرے بدن سے یہ خوشبو آنے لگی اس لئے میرے ماں باپ نے میرا نام سگندھی رکھ دیا۔ کبھی کبھی وہ مجھے

دبوچ لیتے ہیں اور بار بار میرا بدن سونگھتے ہیں اور سونگھ سونگھ کر پاگل سے ہو جاتے ہیں کبھی کبھی دیوار سے ٹکر مار لیتے ہیں۔"

میرے دل میں سیٹھ کے لئے تھوڑی سی جگہ پیدا ہوئی۔ پھر ابکائی سی آنے لگی۔ نہیں نہیں۔ اس موٹے کو اس خوب صورت عورت کو چھونے کا حق بھی نہیں ہے۔!" سگندھی، کیا تمہاری دوسری بہنیں بھی تمہاری طرح سُندر ہیں۔؟"

"نہیں۔!" وہ قطعیت سے بولی۔" وہ سب معمولی شکل و صورت کی ہیں۔ ایک مجھے ہی بھگوان نے اتنا سندر بنا کے اتنا بد قسمت بنا دیا۔!"

وہ ذرا سی سسکی۔

میں اس کی موم کی سی شفّاف گردن پر بوسے ثبت کرتا گیا۔ اس کی سسکیاں بڑھتی گئیں۔ اس نے اپنا چہرہ میرے سینے میں چھپا لیا۔

"سگندھی میرے ساتھ چلو گی۔!"

"کہاں۔؟"

"دُور ہم چل کے کسی گاؤں میں یا کسی جنگل کے کنارے میں زمین خرید کر فارم بناؤں گا کھیتی باڑی کروں گا۔ تم میری بیوی بنکر رہو گی۔ پھر ہمارے بچّے ہوں گے اور وہ بڑے خوب صورت ہوں گے۔"

میں بولتا چلا گیا اور وہ ہنستی چلی گئی اور خواب سے خواب اور امید سے امید ملتی چلی گئی۔ اور زندگی کی شطرنج بنتی چلی گئی۔ جیسے صبح کی دھوپ میں شبنم آلود دیواروں کے نیچے ہری دوب پر سنہری شطرنجیاں بکھرتی چلی جاتی ہیں۔

میں اس کی حیران آنکھوں میں وہ ساری تصویریں دیکھ رہا تھا جو مجھے کلکتہ سے جنگل کی جانب لے جا رہی تھیں۔ وہ سپنے جنھوں نے مجھے آبھا سے چھڑا دیا تھا۔

پھر جیسے ہوا کے ایک جھونکے سے ان حیران آنکھوں کی ساری تصاویر تاریکی میں غائب ہوگئیں۔

وہ بولی ـــــــ "مگر یہ کیسے ہوسکتا ہے، میں تو بیاہتا ہوں۔"

"نامرد سے فوراً طلاق مل سکتا ہے۔ اتنا قانون میں جانتا ہوں۔ دراصل یہ شادی ہی قانون کی نظر میں ناجائز ہے۔"

اس کے چہرے پر محبّت، نور، اجالے کے کئی رنگ آئے۔ پھر اس نے افسردہ ہوکر سر ہلا کر کہا۔

"ہو نہیں سکتا۔!"

"کیوں نہیں ہوسکتا۔؟"

"وہ میرے دونوں بھائی کیا کہیں گے۔ ان کی تعلیم ادھوری رہ جائیگی چھوٹا جو اسکول میں پڑھتا ہے اس کی تو خیر کوئی بات نہیں، لیکن ان دو مینوں کا کیا ہوگا جن کی شادی کا سارا جہیز میرا پتی دیگا۔ پھر میرا اندھا باپ اور بوڑھی ماں اور میں خود۔!"

"ہاں تم خود۔؟" میں نے پوچھا۔

"سیٹھ نے مجھے ہر طرح کا آرام دے رکھا ہے۔ ہیرے جواہرات سے لاد دیا ہے۔ میں چاہوں تو روز ایک زیور خرید سکتی ہوں۔"

"یعنی ایک آرام طلب زندگی۔!"

"ہاں نوکر چاکر، گھر، گاڑی، دولت مجھے کیا میسّر نہیں ہے۔"

"سوائے ایک کے ....." میں نے اُسے معنی خیز نگاہوں سے تاکتے ہوئے کہا۔

"جو قسمت میں نہیں ہے۔ اس کا کیا ہوگا۔ صبر کرنا پڑیگا۔!"

"تم کوئی عاشق کیوں نہیں ڈھونڈھ لیتیں۔"

"یعنی تم کو۔!"

"مجھے نہیں۔ تمہارے میرے خواب نہیں ملتے۔ لیکن تم اپنے جسم کی پکار کے لئے کوئی عاشق تو ڈھونڈھ سکتی ہو۔!"

اس کا چہرہ فق ہوگیا۔ گہرے غم زدہ لہجہ میں بولی۔ تم سچ کہتے ہو مگر کیا کروں مجھ پر کڑی پابندی ہے۔!"

"میکے میں بھی۔؟ عام طور سے تمہاری ایسی عورتیں جب اپنے مائیکے جاتی ہیں تو اکثر گل کھیلتی ہیں۔ شاید اسی لئے وہ جلدی جلدی اور بار بار میکے جاتی رہتی ہیں۔!"

"وہ حربہ بھی میں آزما کر دیکھ چکی ہوں۔ سیٹھ بہت کائیاں ہے۔ اس نے ایک ملازمہ میرے لئے رکھی ہے۔ وہ ہر وقت میرے ساتھ رہتی ہے۔ جہاں میں جاؤں حد تو یہ ہے کہ ٹائیلٹ کے دروازے تک میرے ساتھ جاتی ہے۔ چاہے سسرال ہو یا مائیکا۔ سارے راستے بند ہیں میرے لئے۔"

وہ پھر سسکنے لگی۔!

میں نے کہا۔ "مگر آج کی رات تو وہ تمہارے ساتھ نہیں ہے۔"

وہ بولی ـــــــ "کیونکہ میں سیٹھ کے ساتھ ہوں اور وہ تھرڈ کلاس میں بیٹھی ہوئی ہے۔!"

"اس وقت تم سیٹھ کے پاس نہیں ہو۔ میرے پاس ہو۔!"

وہ چپ رہی۔ میرے کھلے کرتے کے اندر ہاتھ ڈال کر میرے سینے کے بالوں میں دھیرے دھیرے انگلیاں گھمانے لگی۔ دھیرے دھیرے میرے سارے بدن میں چنگاریاں پھوٹنے لگیں اور میں اس کی صراحی دار گردن کے لمبے خم کو بار بار پاگلوں کی طرح چومنے لگا۔

پھر ریشم پر ریشم۔ بالائی پر بالائی۔ پرتوں پر پرتیں۔
اور ساری فضا جوہی کی خوشبو سے بھر گئی۔

●

○

دوسرے دن صبح ہی سے میں نے سیٹھ کو باتوں میں لگالیا۔ باتوں ہی باتوں میں اس نے باداگوری سہائے کی سمادھی پر جانے کا تذکرہ کیا ——— تو میں نے کہا۔

"عجیب بات ہے ۔!"

"کیا عجیب بات ہے جی ۔؟" وہ میری طرف دیکھ کر اپنی بھیانک آواز میں بولا ۔

"عجیب بات یہ ہے سیٹھ جی کہ اس معاملہ میں ، مَیں آپ کی بہت مدد کر سکتا ہوں ۔"

"کس طرح جی ۔ ؟"

"میرے پاس ایک سدّھی ہے ۔"

"کیسی سدھی ۔ ؟"

"ایک سادھو مہاتما نے مجھے دی تھی. اس کی ایک چٹکی کھلا کر منتر پڑھنے سے ٹھیک نو مہینے کے بعد بچّہ پیدا ہو جاتا ہے۔"

" تمہیں یہ سدّھی. یہ چٹکی کہاں سے ملی . ؟"

" میں نیپال کے جنگلوں میں بہت گھوما ہوں۔ بُدھ سادھوؤں اور مہاتماؤں کی سدا سے خدمت کرتا آیا ہوں. وہاں مجھے سوامی گورکھ ناتھ نرنکاری کے درشن کرنے کا موقع ملا۔ دو سال کی خدمت کے بعد انہوں نے مجھے یہ سدھی بخشدی. جس عورت کے چاہوں بچّہ پیدا کردوں۔"

"تم اس سدھی کا کیا لیتے ہو جی۔!" سیٹھ نے مجھے مشتبہ نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا.

"کچھ لینا پاپ ہے۔!"

" پھر بھی۔!"

"بول جو دیا سیٹھ جی. مجھے میرے گورو نے بتایا تھا کہ اگر تم نے اس سدھی کے لئے کہیں بھی مول بھاؤ کیا تو یہ سدھی تمہارے ہاتھ سے جاتی رہے گی۔"

" تو اس کا یہ مطلب ہوا کہ تم مول بھاؤ نہیں کروگے، مگر جو ہم اپنی خوشی سے دیں گے وہ لے لوگے۔!"

" نہیں ۔ کچھ بھی تو نہیں لے سکتا سیٹھ جی. ایک پیسہ نہیں. ایک پائی نہیں۔ بالکل مفت کا بچّہ پیدا کرونگا۔!"

"کیسے۔؟"

میں اس کے لئے صبح سے تیّار تھا. تیل کی ایک چھوٹی سی شیشی کو صاف

کر کے اس میں مَیں نے سگریٹ کی راکھ بھر لی تھی۔

"تمہارے پاس کوئی مٹھائی ہوگی۔"

"ہاں قلاقند ہے۔!"

"قلاقند بھی چلے گا۔!" میں نے کہا۔

"چٹکی مجھے کھلاؤ گے۔؟" سیٹھ نے پھر پوچھا۔

میں نے کہا ——— "ایسی سدھی ہے جو کھائے اس کے بچّہ پیدا ہو جائے۔"

فوجی ہنسنے لگا۔ سگندھی کے نیم متبسّم لب چمکنے لگے۔

"تم مذاق کرتے ہو۔"

"مذاق نہیں سیٹھ جی۔ بالکل سنجیدہ ہوں۔"

اتنا کہہ کر میں نے سوٹ کیس کھولا۔ اس میں سے سگریٹ کی راکھ والی شیشی نکالی اور اسے سیٹھ کو دکھلا کر بولا ——— "اس میں سے ایک چٹکی لے کر قلاقند میں ملا کر تمہاری سیٹھانی کو تمہارے سامنے کھلا دیتا ہوں۔ بھگوان نے چاہا تو ٹھیک نو ماہ بعد تمہاری سیٹھانی کے بچّہ پیدا ہوگا۔ کسی سادھو کی سمادھی پر جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ ایک پائی خرچ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اب تک بارہ بے مُراد عورتوں کو بامراد کر چکا ہوں۔ گورو گولک ناتھ شری سوامی نرنکاری بھگت دھاری بال برہمچاری کی کرپا سے تمہاری سیٹھانی کی گود ہری ہو جائے گی۔"

سیٹھ کا چہرہ امیدوں سے کھل گیا بولا ——— "تو ماری سیٹھانی کو چٹکی دیدو۔"

سیٹھانی نے قلاقند کا ایک ٹکڑا اسٹین لیس اسٹیل کے ایک ڈبے سے نکال کر میری ہتھیلی پر رکھا۔ میں نے تیل کی شیشی سے سگریٹ کی راکھ کی چٹکی لے کر قلاقند میں ملادی اور اسے اپنے ہاتھ پر رکھ کر یوں بولنا شروع کیا۔

"ادم شری شری ۱۰۸ سوامی گورکھ ناتھ نرنکاری جگت دھاری برہمچاری مہا اُپکاری کی دیا درشٹی سے یہ بھسم کھلاتا ہوں۔ ردّے پر ردّا چڑھاتا ہوں۔ جو ناری یہ چٹکی کھائے سوامی ناتھ کی اپار درشٹی سے گربھ وتی ہو جائے۔ کالا کھیرا۔ ماتا چیرا۔ ڈبل ڈیرا اوم ہڑ بونگ گونگ وسل وسل وسل جھونگ۔!"

میں نے سگندھی کا منہ آہستہ سے کھول کر اس کی طرف دیکھ کے ایک آنکھ میچ کے اسے یہ قلاقند کھلادی۔

فوجی کا مارے ہنسی کے بُرا حال تھا لیکن میں، فوجی اور سگندھی تینوں اپنی اپنی ہنسی روکے ہوئے تھے۔ سیٹھ بے حد سنجیدہ ہو کر اس پورے عمل کو دیکھ رہا تھا۔ چٹکی کھا کر سیٹھانی سیٹھ کے قدموں کی طرف بیٹھ گئی۔ اور لمبا سا گھونگھٹ کھینچ لیا۔ شاید اس نے خاموشی سے ہنسنا شروع کر دیا تھا۔ کیونکہ اس کا سارا جسم ہل رہا تھا۔

"تو بچّہ سچ مچ پیدا ہو گا۔؟"

"ٹھیک نو مہینے بعد۔" میں نے سیٹھ سے کہا۔ "آزمائی ہوئی چٹکی ہے۔ یقین نہ آئے تو پانچ ہزار کی شرط لگاتے ہو۔"

گویا سیٹھ کو اطمینان آگیا۔ بولا ——— "نا بابا۔ شرط ورط ہم نہیں لگاتے مگر ہم کو اب اطمینان ہے۔"

میں نے جیب سے ایک کارڈ نکال کر اسے دیا۔" اس میں میرا پتہ لکھا ہے۔ اگر ٹھیک نو ماہ بعد بچہ پیدا نہ ہو تو مجھے نو ہزار گالیاں لکھ کر بھیجنا۔"

سیٹھ نے کارڈ اپنی سیٹھانی کو رکھنے کے لئے دیدیا۔ سگندھی نے پڑھ کر بڑی احتیاط سے رکھ لیا۔

سیٹھ بولا۔ "تم نے میرا بھلا کیا ہے تو ایک بھلا میں بھی کر دوں۔"

میں اس کے منہ کی طرف دیکھنے لگا۔

"ہاں ! " سیٹھ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔" تم نے ابھی باتوں باتوں میں ذکر کیا تھا کہ تم ہماچل پردیش میں زمین خریدنے جا رہے ہو۔ اور ایک فارم کھولنے کا ارادہ رکھتے ہو۔"

میں نے ہاں میں سر ہلا دیا۔

" مگر ہماچل پردیش میں زمین بہت مہنگی ہے۔ تین چار ہزار روپے فی ایکڑ سے کم نہیں ملے گی۔ میں تمہیں تین سو روپے ایکڑ میں زمین دلاتا ہوں۔"

میں نے کہا۔" بنجر ہوگی۔"

وہ بولا۔ "بنجر نہیں ہے۔ بڑی زرخیز ہے۔!"

"پھر اتنی سستی کیوں مل رہی ہے۔؟"

"وہ ایک اُجاڑ ویران جگہ پر واقع ہے۔ تین طرف جنگل ہے اور پہاڑیاں ہیں۔ بیچ میں تیس ایکڑ کا یہ ٹکڑا ہے۔ بارش وہاں کافی ہوتی ہے۔ ایک کنواں بھی ہے جو بارہ مہینے پانی سے بھرا رہتا ہے۔ اور ایک ندی بھی ہے۔"

"پھر اس کا مالک مجھے اتنے سستے داموں پر زمین کیوں دینے لگا۔؟"

"تم پوری بات تو سنتے نہیں ہو۔" سیٹھ ذرا اکڑ دے لہجہ میں بولا۔

"وہ زمین دراصل ایک بیوہ کی ہے۔ آس پاس کوئی گاؤں نہیں۔ کوئی آبادی نہیں تیس کوس پیدل چل کر ایک ریلوے اسٹیشن آتا ہے۔ بس، وہ بیوہ اس زمین کی اکیلے دیکھ بھال نہیں کر سکتی۔

"وہ بیوہ اس زمین کو بیچ کر کیا کریگی۔؟

وہ اپنی لڑکی کی سسرال چلی جائے گی۔ اس بیوہ کی ایک ہی لڑکی ہے۔ اور کسی دور دراز کے گاؤں میں بیاہی ہوئی ہے۔ یہ بیوہ، یہ زمین بیچ باچ کر اپنی لڑکی کے پاس چلی جائے گی۔!"

"تمہیں یہ سب قصہ کیسے معلوم ہے۔؟" میں نے پوچھا۔

"اس لڑکی کی سسرال ہمارے قصبہ کے قریب ہے۔ میں اس لڑکی کے گھر والے کو جانتا ہوں۔ وہی یہ سودا لیکر میرے پاس آیا تھا۔ معاملہ تین سو روپے ایکڑ پر پٹ گیا۔ میں جا کر زمین دیکھ بھی آیا۔ مگر جب یہ دیکھا کہ آس پاس دُور دُور تک کوئی گاؤں کوئی آبادی نہیں تو میں نے اس زمین کو خریدنے کا خیال چھوڑ دیا۔"

"مگر مجھے تو ایسی ہی جگہ پسند آئے گی۔"

"ہاں سمجھو، بھگوان نے یہ جگہ اب تک تمہارے لئے ہی رکھی تھی۔"

"تمہیں کیسے معلوم ہے کہ یہ زمین اب تک بک نہیں گئی ہوگی۔؟"

"تین ماہ پہلے تو بکی نہیں تھی۔ اب کہاں بکی ہوگی۔ کون بگلا تمہارے ایسا اس جنگل میں جا کے رہے گا۔؟"

میں خوشی سے اچھل پڑا۔ میں نے کہا۔ "مجھے اس کا اَتہ پتہ بتاؤ۔"
سیٹھ بولا۔ دو اسٹیشن چھوڑ کر شیپرا جنکشن آئے گا۔ اُدھر چھوٹی لائین کی گاڑی بھی جاتی ہے۔ تم وہاں اُتر جاؤ اور دھولیا قصبہ کا راستہ پوچھ لو۔ تم جب دھولیا قصبہ کو پہونچو گے تو وہاں سے کواڑی قلعہ کا راستہ پوچھ لینا۔ وہ قلعہ اب پرانا کھنڈر ہے۔ شکستہ حالت میں ہے۔ جنگل میں ہے۔ کوئی وہاں جاتا نہیں ہے۔ وہ دھولیا قصبے سے تیس کوس کے فاصلے پر ہے۔ اس قلعہ کے شمال میں کوئی آدھے میل کی چڑھائی پر اس بیوہ کا مکان ہے۔ اور اس کے چاروں طرف وہ زمین۔ تیس ایکڑ کے قریب زمین ہوگی۔ ایک کنواں بھی ہے۔ صاف ستھرا جنگل کا ماحول ہے۔ تمہیں بہت پسند آئیگی وہ جگہ ——— ! وہاں ندی بھی ہے۔"
"میں تو ابھی سے اس کے خواب دیکھنے لگا ہوں۔" میں نے ہنس کر سیٹھ سے کہا۔ "ہاں، مگر اس بیوہ کا نام کیا ہے۔ ؟"
"سروجا اس کا نام ہے۔ بڑی سندر بیوہ ہے۔"
فوجی نے میرے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "میں تمہیں راستہ بتا دوں گا۔"
"تم کیسے بتاؤ گے۔ کیا تم وہاں کبھی گئے ہو۔ ؟"
"نہیں وہاں تو کبھی نہیں گیا۔ نہ مجھے اس بیوہ کے مکان کا کوئی علم ہے۔ مگر میں شہ پارا اسٹیشن پر اتر دوں گا۔"
"شہ پارا نہیں۔ شپرا۔" سیٹھ نے جلدی سے کہا۔
"شپرا نہیں۔ شہ پارا۔" فوجی بولا۔ "صرف گنوار لوگ ہی شپرا بولتے ہیں۔"

سیٹھ کے نتھنے پھڑک گئے۔ مگر وہ چپ رہا۔
فوجی بولا۔ "تم میرے ساتھ شہ پارا جنکشن پر اترنا۔ وہاں سے ہم اکٹھے ہی ساتھ چلیں گے۔ پارپیا قصبہ کو۔ میں پارپیا قصبہ کا رہنے والا ہوں۔ وہاں سے میں تمہیں کواڑی قلعہ کا راستہ بتا دوں گا۔"
"ٹھیک ہے۔ میں تمہارے سنگ جاؤں گا۔ شپرا اسٹیشن سے پارپیا۔"
"شپرا نہیں۔ شہ پارا۔!" فوجی بولا۔
یکایک سگندھی نے اپنا ماتھا پکڑ لیا۔
سیٹھ، نے پوچھا۔ "کیا بات ہے۔؟"
سگندھی بولی۔ "سر میں چکر آرہے ہیں۔!"
میں نے خوش ہو کر کہا۔
"سیٹھ جی۔ مٹھائی۔ مٹھائی کھلاؤ۔ تمہاری سیٹھانی گربھ وتی ہو گئی ہے۔"
سیٹھ نے پہلے تو میری طرف حیرت زدہ نگاہوں سے دیکھا جیسے کہنا چاہ رہا ہو
"اتنی جلدی یہ چمتکار۔!"
پھر اس نے اپنے دونوں ہاتھ چھت کی طرف اٹھا کر کہا۔
"دھنیہ ہو بھگوان تم دھنیہ ہو۔"
سیٹھانی ایک لمبا گھونگھٹ کھینچ لیا تھا۔ اس گھونگھٹ کی آڑ سے وہ کبھی کبھی چنچل شریر نگاہوں سے میری طرف دیکھ لیتی تھی۔ اور کبھی کبھی میں بھی آنکھیں چرا کر اس کی طرف دیکھ لیتا تھا۔ اس کے چہرے پر ایک دل شاد اور سیراب چمک آرہی تھی۔ بھرپور اور شاداب، جیسے بارش کھل کے برس گئی ہو۔
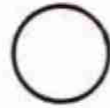
فوجی مجھے آہستہ سے بتانے لگا۔" سربھنی کی پہاڑیاں ہمارے گاؤں سے قریب ہیں اور کواڑی قلعہ تو صرف دس کوس پر ہے۔ میں تمہیں وہاں تک چھوڑنے کے لئے کوئی آدمی ساتھ کر دوں گا۔ مگر ایک شرط ہے۔ تمہیں پہلے میرے گاؤں چلنا پڑیگا۔ میری شادی میں شریک ہونا پڑیگا۔"

"جانے کب ہے تمہاری شادی۔؟" میں نے پوچھا۔

" ابے کل ہوگی میری شادی۔!" رونق سنگھ خوشی سے چہکتے ہوئے بولا پھر اپنی ران کھجانے لگا۔

" دوسرا ایک راستہ بھی جاتا ہے۔ سربھنی کی پہاڑیوں کو اسٹیشن سے۔ دھولیا۔ اور وہ چھوٹا اور سیدھا راستہ ہے۔" سیٹھ بولا۔" ایک ٹپ اور۔!" رونق سنگھ جلدی سے بولا۔" تم اپنے ٹپ رہنے دو سیٹھ۔ میں اس بابو کو ضرور اپنی شادی پر لے جاؤں گا۔!"

اس نے میرے کندھے پر زور سے ہاتھ رکھ دیا۔

ایک تو فوجی۔ دوسرے ساتھ میں رائفل تیسرے بالکل نئی جگہ جانے وہ سربھنی کی پہاڑیاں کدھر ہیں۔ ؟ وہ کواڑی نام کا قلعہ کدھر ہے۔ ؟ وہ سردجا بیوہ کہاں رہتی ہے۔ ؟ ــــــــ ضرور مجھے اس فوجی کے ساتھ اس کے گاؤں ہی جانا پڑیگا۔

"کیا نام ہے تمہارے گاؤں کا۔ ؟" سیٹھ نے رونق سنگھ سے پوچھا۔

"پاریپا۔ !"

سیٹھ نے شبے سے سرہلایا جیسے کہنا چاہتا ہو، کبھی نام نہیں سنا۔ اس گاؤں کا مگر فوجی کے نخوت بھرے چہرے کو دیکھ کر چپ ہو گیا۔

٭ ٭ ٭

جب شپارا کا اسٹیشن آیا تو سگندھی ابھی تک سو رہی تھی۔ گہری اور آسودہ نیند کر دھانی ساڑی کے پتلے گھونگھٹ میں ماہتاب سو رہا تھا۔ میں بہ حسرت دیاس ایک نگاہ اس کے مخمور حسن پر ڈالی۔ پھر سیٹھ سے ہاتھ ملا کے اسی چار برتھ والے کوپے سے باہر نکل آیا۔ میرے پیچھے پیچھے رونق سنگھ بھی چلا آیا۔

میں نے اپنا سامان اسٹیشن کے لگیج آفس میں رکھوا دیا۔ اپنے ساتھ صرف ایک ہینڈ بیگ لے لیا۔

رونق سنگھ کے پاس دو ٹرنک تھے، ایک ہینڈ بیگ، ایک رائفل اور اس کا گاؤں یہاں سے بیس کوس دُور تھا۔

"یں اتنا سامان خود تو اٹھا کے چل نہیں سکتا۔ ایک مزدور کرنا پڑیگا۔"

"مزدور کہاں سے ملے گا۔ ؟" میں نے پوچھا۔

وہ بولا۔ "سمری انتظام کر دیگی۔!"

"سمری کون ہے۔ ؟"

وہ بولا۔ "ایک حلوائین ہے۔ اس کا گھر والا دو سال ہوئے مر گیا۔ ایک بچّہ ہے۔ اس کا۔ آٹھ سال کا۔ دونوں مل کر دوکان چلاتے ہیں۔"

"مگر ہمیں اس کی دوکان سے کیا لینا۔ ؟"

"بابو ـــــ بیس کوس کا سفر ہے۔ پوری بھاجی سے پیٹ بھر کے چلیں گے۔ ورنہ راستہ میں ٹیں بول جاؤ گے۔ ؟"

سمری ایک سیاہ فام عورت تھی۔ بڑی بڑی آنکھوں میں لال لال ڈورے گٹھا ہوا جسم۔ طاقتور جسم بجلی کی سی شعاعیں نکلتی تھیں اس کے جسم سے، جیسے کوئی مقناطیسی رَو اس کے جسم کے چاروں طرف گردش کر رہی ہو۔ ایسی گہری نظروں سے نوجوان گاہکوں کو دیکھتی۔ جیسے پنجہ مار کر دبوچ لے گی۔ مجھ پر ایک نگاہ ڈال کے اس نے مجھے چھوڑ دیا۔ جیسے کہہ رہی ہو۔ یہ شہری نزاکتوں کا مارا ہوا جسم میرے کس کام کا۔ ؟ پھر اس کی نگاہیں رونق سنگھ کے تگڑے ڈیل ڈول پر جم گیئں۔ وہ زور سے ہنسی۔ ایک بھدّی گنوار ہنسی۔ اس کی آواز بیٹھی ہوئی تھی اور اس میں کسیقدر مردانہ پن تھا۔

"آ گئے سنگھ جی۔ شادی کرانے۔!"

"ہاں سمری آ گیا۔ اب جلدی سے گرم گرم پوری بھاجی ڈال دو۔ اور ایک مزدور کا بندوبست کر دو۔ دُور اپنے گاؤں جانا ہے۔!"

"مزدور کا بھی بندوبست بھی ہو جائے گا۔ مگر ایسی جلدی بھی کیا ہے۔ ذرا اس مٹکی سے پانی لے کر ہاتھ منہ دھو لو۔ کھا پی کر اس پیپل کے پیڑ کے نیچے گھڑی دو گھڑی آرام کر لو۔ پھر چلے جانا۔"

"نہیں سمری۔ اب ہاتھ منہ گھر جا کر ہی دھوئیں گے۔ بیس کوس کا سفر ہے۔ پیپل کے نیچے کھٹیا ڈال کے سو گئے تو گھر کب پہونچیں گے۔؟"

"جیسی تمہاری مرضی۔!" سمری کسی قدر اُداس ہو کر بولی۔ پھر اس نے اپنے بیٹے سے کہا۔

"اے بٹیا لیک کے گھمرو کو بلا لا۔ کہنا بیس کوس پار پیا جانا ہے۔ اچھی مجوری ملے گی۔ صوبیدار رونق سنگھ شادی کرانے اپنے گھر جا رہے ہیں۔"

وہ پھر زور سے ہنسی۔ وہ ٹھنڈے برف کے ٹکڑوں میں بکھرتی ہوئی ہنسی میرے جسم میں ایک کپکپی کی لہر دوڑ گئی۔ کیسی مرد مار عورت ہے۔ مگر ہمیشہ سے ایسی نہیں تھی۔ رونق سنگھ نے دھیرے دھیرے سرگوشیوں میں مجھے بتایا۔ جب تک بھوگلا حلوائی زندہ رہا۔ یہ اس کی وفادار رہی۔ کوئی بات نہیں سنی گئی۔ اس کی ہاں حلوائی کے مرنے کے بعد جب اسے اپنے چھوٹے سے بچے کو پالنا پڑا اور یہ دوکان سنبھالنی پڑی اور جب اسے باہر کی دُنیا سے واسطہ پڑا تو یہ بھی شکاریوں کی دُنیا میں شکاری بن گئی۔ بننا پڑتا ہے۔ بابو اسٹیشن پر سب

لوگ اسے جانتے ہیں۔ قصبہ میں سب لوگ اس سے تھراتے ہیں۔ پولیس والوں کو اس نے مٹھی میں کر رکھا ہے۔ اور کئی ڈاکوؤں سے بھی اس کا تعلق ہے۔ بڑی جھٹکے دار عورت ہے۔)

"جھٹکے دار سے کیا مطلب ہے تمہارا۔؟" میں نے پوچھا۔

رونق سنگھ میری طرف دیکھ کر چند ثانئے چپ رہا پھر ایک شریر ہنسی اس کی آنکھوں میں ابلنے لگی۔ یہ ہنسی جو اس کے لبوں سے لے کر اس کی آنکھوں تک پھیل گئی تھی۔ مگر وہ چپ رہا۔ کچھ کہنے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ میں سب سمجھ گیا تھا۔)

"شاید اسی لئے تمہیں دوپہر کے لئے روک رہی تھی۔" میں نے اس سے بہت دھیرے سے پوچھا۔

رونق سنگھ سے اس کی ہنسی روکی نہیں گئی۔ ایک زوردار چھو کی آواز کے ساتھ منہ کا لقمہ باہر آرہا۔

سمری ڈپٹ کر بولی۔ "کسی کی برائی کرو گے تو یہی ہو گا۔"

اور جب ہم پیسے دیکر چلنے لگے تو اس نے پھر گہری نگاہوں سے رونق سنگھ کو تاکتے ہوئے کہا۔

"مگر جاؤ گے کہاں سنگھ جی۔؟ دو ماہ بعد تو لوٹ کے آؤ گے ہی۔ اس اسٹیشن پر پھر ہاتھ پکڑ لوں گی۔!"

اتنا کہہ کر سمری نے رونق سنگھ کا ہاتھ پکڑ لیا۔ گرفت اتنی مضبوط تھی کہ ہاتھ چھڑاتے چھڑاتے رونق کا منھ لال ہو گیا۔ دیر تک سمری ہنستی رہی اور

ہمارے جانے کے بعد بھی اس کی ہنسی کی لہریں دُور تک ہمارا تعاقب کرتی رہیں۔ دُور تک رونق سنگھ کا چہرہ لال رہا اور اس نے مجھ سے آنکھ بھی نہیں ملائی۔

دوپہر تک ہم نے بارہ کوس طے کر لئے پھر آرام کرنے کے لئے راستہ میں ایک گاؤں سے باہر کنوئیں کے پاس بانسوں کے جھنڈ میں لیٹ گئے۔ یہاں کچھ آم کے پیڑ تھے۔ کچھ جامن کے، دو درختوں سے املتاس کی سوکھی پھلیاں لٹک رہی تھیں اس کے پاس ہی ایک ٹیلے پر ناگ پھنی کی جھاڑیاں تھیں۔ بانسوں کے جھنڈ کے قریب رہٹ چل رہا تھا۔ اور ایک کسان لڑکا ہاتھ میں بانس کی پتلی چھڑی لئے بیلوں کو گھما رہا تھا اور کھیتوں میں پانی دیئے جا رہا تھا۔ صدیوں پرانا منظر۔ رہٹ کی روں روں میں گہری شانتی۔ سو جاؤ۔ کچھ نہیں بدلا۔ سو جاؤ۔ کچھ نہیں بدلا۔ ذرا پرے درختوں سے گھرے ہوئے ایک گاؤں کی چھتیں۔ کچھ کچے مکان۔ کچھ پکے۔ کہیں پر چھپر کہیں پر کھپریل۔

"وہ آخری سرے پر مکان دیکھتے ہو۔؟" یکایک رونق سنگھ نے مجھ سے پوچھا۔

"وہ کنگروں والا۔؟"

"ہاں۔ وہ مکان ساوتری کا ہے۔"

میں چونک کر اٹھ بیٹھا۔

"تو تم نے ساوتری کو دیکھا ہے۔"

"ہاں ـــــ شپارا کے ایک میلے میں۔"

"کیسی ہے۔؟"

"تمہاری شہری ایکٹریس۔ فلم ایکٹریس۔ جوان اور خوب صورت۔ اگر دیہاتی کپڑے پہن لے تو کیسی لگے گی۔؟"

میں نے اپنے ذہن میں دو تین ایکٹرسوں کو وہ کپڑے پہنائے اور دیکھا۔ اور دیکھ کر کہا۔

"معلوم ہو گیا کیسی لگے گی۔!"

"بس ویسی ہے میری ساوتری۔!"

"کچھ بات ہوئی اس سے میلے میں۔؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں۔ بس دو تین جھلکیاں یاد ہیں میلے کی۔ وہ سرمہ خرید رہی تھی۔ وہ چوڑیاں پہن رہی تھی۔ وہ جھولے پر تھی اور ہنس رہی تھی۔ ہوا میں اس کا لہنگا اڑا اڑ جاتا تھا۔ بس یہی دو تین تصویریں ہیں میرے پاس اور انہی دو تین تصویروں نے مجھے موہ لیا۔!"

"تم نے کوئی بات تو کی ہوتی۔؟"

"کیسے کرتا۔ ساتھ میں اس کا باپ تھا اور بھائی اور ماں۔"

"میلے کے بعد کبھی ملنے کی کوشش کی۔؟"

"نہیں۔ اس کے ماں باپ کی بڑی پابندی ہے اس پر۔ بہت نگرانی کرتے ہیں اس کی۔ دو تین بار یہاں آیا۔ اس گاؤں میں چھپ کر، مگر اس کی صورت دیکھنے کو نہیں ملی۔ بڑا سخت گیر ہے۔ اس کا باپ۔ بس میں اس کے مکان کی چھت کے کنگورے دیکھ کر واپس چلا گیا۔"

"خیر کوئی مضائقہ نہیں۔ اب زندگی بھر تمہیں دیکھنے کو ملے گی۔!"

لیٹے لیٹے وہ بہت دیر تک چپ رہا۔ جیسے آنے والے زندگی کے مزے لے رہا ہو۔ پھر اٹھ کر بیٹھ گیا۔ جیب کے اندر ہاتھ ڈال کر اس نے اپنا بٹوہ نکالا۔ بٹوے سے ایک تصویر نکالی اور میرے ہاتھ میں دیدی۔ یہ ایک نوجوان دیہاتی دوشیزہ کی تصویر تھی۔ سچ مچ بڑی سندر، من موہنی، تصویر میں کھل کھلا کر ہنسے جا رہی تھی۔ چہرے پر کچھ عجیب سی شرم، بے باکی، ہچکچاہٹ اور دلبری کا کچّا امتزاج، ان شریر آنکھوں کی چنچل ہنسی دل کو گدگدانے لگی۔

میں نے پوچھا۔ "یہی ہے ساوتری۔؟"

اس نے آہستہ سے ہاں میں سر ہلا یا۔!

"یہ تصویر تمہیں کیسے ملی۔؟"

"اس میلے میں ایک فوٹو گرافر سے حاصل کی۔ تیس روپئے دیئے تھے۔ بڑی مشکل سے یہ تصویر ملی۔ چار سال سے اسے کلیجے سے لگا کے رکھا ہے۔!"

میں نے پوچھا۔ "آخر یہ شادی طے کیسے ہوئی۔"

"کچھ مشکل نہیں پڑی۔ ایک نائن کے ذریعے سگائی پکّی ہوگئی۔ وہ لوگ بھی اپنے گاؤں کے سب سے امیر لوگ ہیں۔ ہم اپنے گاؤں کے ذات برادری بھی ایک ہے۔ کچھ مشکل نہیں پڑی۔!"

میں نے تصویر اس کو واپس دیدی۔ اس نے تصویر لے کر پوچھا۔

"لگتی ہے نا فلم ایکٹریس۔"

"بالکل۔!"

"کس سے اس کی صورت ملتی ہے۔؟"

میں نے دو تین ایکٹریسوں کے نام لئے۔

اس نے انکار میں سر ہلا کے کہا۔" نہیں ساوتری ان سب سے زیادہ خوب صورت ہے۔"

رونق نے گھاس کا ایک تنکا دانتوں تلے دبالیا۔ اور دُور دراز پھیلے ہوئے آسمان میں تصویریں بنانے لگا۔ گھر آنگن، باغیچہ، بچّے، پھول، ساوتری پھول ہی پھول۔!

میں نے کہا ____ چلو۔ اب چلیں۔ تم تو اب اسی دھرتی سے چپک ہی گئے۔ اب ایسا بھی کیا۔ آخر کل یہیں تو بارات لے کر آئیں گے۔!"

رونق اٹھ بیٹھا۔ میں ہنس کر بولا ____ "آج دونوں گھروں میں کیا دھوم دھڑکا ہوگا۔ کیسے زور سے ڈھولک بجے گی۔ چلو جلدی چلیں۔!"

" ابھی تو آٹھ کوس پر ہے ہمارا گھر۔ رات ہو جائے گی وہاں تک ہمیں پہونچتے پہونچتے۔!"

میں نے کہا۔ " مگر گھمو آگے گیا ہے۔ سامان لے کر۔ وہ خبر تو کر ہی دیگا۔"

راستہ میں مَیں نے اس سے پوچھا۔" تم کواڑی قلعہ تک کبھی گئے ہو۔؟"

" ہاں گیا تو ہوں مگر اس کے آگے سربھنی کے جنگلوں میں کبھی نہیں گیا۔ بڑا اجاڑ علاقہ ہے۔ تمہیں وہاں فارم بنانے کی کیا سوجھی ہے۔؟"

میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ چلتا رہا۔ پھر میں نے اس سے پوچھا۔

" کواڑی کے قلعہ میں آج کل کون رہتا ہے۔؟"

"کوئی نہیں۔ ارے وہ تو کھنڈر ہے، کھنڈر۔ سو سال پُرانا۔"

٭ ٭ ٭

پھر سُورج ڈوب گیا۔ اور نیلے آسمان کا کانچ شفّاف ہوتا گیا۔ اور نیم، شیشم اور املتاس کے پیڑوں کی اُلجھی سلجھی شاخیں اس شفّاف کانچ کے پسِ منظر میں سیاہ مَرمَریں جالیوں کی طرح ابھرنے لگیں۔ پھر رات گہری ہوتی گئی اور راستہ کا دھندلا غبار بھی نظر سے اوجھل ہوگیا۔ پھر سیاہی مائل سی جھاڑیوں میں نظر نہ آنے والے پھولوں کی خوشبو سے رہگزار بھر گئی۔ اور دھیرے دھیرے رونق سنگھ کچھ گنگنانے لگا۔ اور ہم نے بہت سا فاصلہ خاموشی میں طے کیا۔ ایسی خاموشی جو کچھ بولتی نہیں ہے لیکن دلوں میں جذبات کا سونا رولتی ہے۔ !

پھر برگد کا ایک بہت بڑا درخت نظر آیا۔ یہاں دو راستے الگ ہوتے تھے۔ یہاں آکر رونق سنگھ رک گیا۔ سر سے ٹوپی اتار کر اس نے اپنے خش خشی بال کھجائے، پھر رومال سے منہ صاف کیا اور بولا۔

"یہاں سے دو راستے الگ ہوتے ہیں۔ ایک تمہارے کواڑی قلعہ کو جاتا ہے۔ دوسرا میرے گاؤں کو۔"

اس کی آواز میں خوشی کی لہر تیز ہوگئی تھی۔

میں نے کہا۔ "آج گھر پر سب لوگ بڑی بے چینی سے تمہارا انتظار کر رہے

ہوں گے۔!"

"ہاں۔" وہ بولا۔

"میری ماں اور پتاجی اور چھوٹا بھائی اور میری پندرہ سال کی بہن کنتل۔!"

اس کی نگاہوں میں اس کے گھر والوں کے چہرے گھومنے لگے۔

"آؤ۔ چلیں۔" اس نے مسرّت بھری ایک سانس لے کر کہا۔ اور اس کے قدم دھیرے دھیرے تیز ہونے لگے۔

گاؤں کی چوحدی نظر آنے لگی۔ چھپّروں کے باہر الاؤ اور کتّوں کے بھونکنے کی آوازیں اور بچّوں کے چلاّنے کی آوازیں۔ کوئی دروازہ کھُلتا ہوا، کوئی بند ہوتا ہوا اور مویشی خانوں سے اٹھتا ہوا دھواں۔ کسی پیڑ کے نیچے بندھی ہوئی بھینس کے ڈکرانے کی آواز اور کسی کسان کا سایہ قریب سے گزر کر اندھیرے میں ملتا ہوا۔ تنگ سی گلیاں اور مٹی اور گوبر کی بوئیں، پھول کی طرح کھلتی ہوئی کسی کی ہنسی کی چہک، پھر سنّاٹا۔ صرف ہم دونوں کے قدموں کی چاپ۔ پھر کسی نے دروازے کی آڑ سے پوچھا۔

"کون ہے۔؟"

رونق سنگھ نے آواز پہچان کر کہا۔ "میں ہوں۔ اکبر چاچا۔!"

مگر اکبر چاچا نے جیتے رہو بھی نہیں کہا۔ دروازہ دھیرے سے بند ہوگیا ہم آگے چلے گئے۔ آگے جا کر یہ تنگ گلی کشادہ ہوگئی ——— یکایک سامنے سے ایک اونچی حویلی کے در و دیوار نظر آنے لگے۔ اور جھلملاتی روشنیاں

"گھر آگیا۔" رونق نے سامنے حویلی کی طرف اشارہ کر کے کہا اور اس کی آواز حدّت سے کانپنے لگی۔

وہ آہستہ سے بولا۔ "آج لڑکیوں نے رَت جگا رکھا ہوگا۔ زور سے ڈھولک بج رہی ہوگی۔ اندر کے کسی کمرے میں۔"

وہ حویلی ہر قدم پر ہمارے قریب آتی گئی۔ تھوڑی دیر میں ہم اس کے سامنے تھے۔ دروازہ بند نہ تھا۔ ذرا سا کھلا تھا۔ رونق نے دستک نہیں دی۔ خاموشی سے اندر چلا گیا۔ میں اس کے پیچھے پیچھے۔

آنگن میں سنّاٹا تھا۔ اور اندھیرا۔ صرف تلی کے دیول پر ایک دیا ٹمٹما رہا تھا۔ اندر ایک محراب دار برآمدے کے چوبی ستون سے لگی پندرہ سولہ برس کی ایک لڑکی کھڑی تھی۔ وہ بھیّا کہہ کر رونق سنگھ سے لپٹ گئی۔ اس کی آواز میں سسکی تھی۔ عورتیں خوش ہوں تب بھی روتی ہیں۔ غم میں ہوں تب بھی روتی ہیں۔

رونق نے کنتل کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیر کر اُسے الگ کیا۔ پوچھا۔

"اماں کہاں ہیں۔؟"

"پتاجی کے پاس۔"

"اور پتاجی کہاں ہیں۔؟"

"اندر دیوان خانے میں۔!"

ہم لوگ اندر دیوان خانے میں گھُسے۔ ایک تخت پر اَدھیڑ عُمر کا تگڑے جسم کا آدمی جُھکا ہوا کچھ کاغذات دیکھ رہا تھا۔ قریب میں ایک عورت

سر پر ساڑی کا پلو ڈالے ہاتھ میں گلاس لئے کھڑی تھی۔

"لو پی لو ـــــ!" وہ بولی۔

ادھیڑ عُمر کے آدمی نے کاغذات سے نظریں اٹھائے بغیر کہا

"نہیں مجھے نہیں چاہیئے۔!"

رونق سنگھ آگے بڑھا۔ اس کے پاؤں کی چاپ سنکر ادھیڑ عُمر کے آدمی نے سر اٹھایا اور رونق سنگھ چونک کر رہ گیا۔ رونق سنگھ نے اپنی ماں اور باپ کے پاؤں چھوئے۔ ماں جلدی سے اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر خاموشی سے وہاں سے کھسک گئی۔

دیوان خانے میں بالکل سناٹا تھا۔ دیوار سے لگی کنتل ہم سب کی طرف چُپ چاپ سانس روکے دیکھ رہی تھی۔

"گھر میں ایسی خاموشی کیوں ہے۔؟"

"نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں۔!" ادھیڑ عُمر کا آدمی دھیرے سے کھنکار کر بولا۔

"ڈھولک بھی نہیں بج رہی ہے۔ رُوشنیاں بھی نہیں ہیں۔"

"وہ ـــــ وہ ـــــ!" ادھیڑ عمر کا آدمی کھنکار کر گلا صاف کرنے لگا۔ یہ گلا صاف کرنے کی کوشش بالکل نئی تھی۔

رونق سنگھ اپنے باپ کی طرف دیکھنے لگا۔ باپ چپ تھا۔

"گھر میں اندھیرا کیوں ہے۔ کیا بات ہے۔؟ کسی رشتہ دار کی موت ہو گئی ہے کیا۔؟"

"نہیں۔ !" ادھیڑ عمر کے آدمی نے زور سے سر ہلایا۔
"کیوں کوئی حادثہ ہو گیا۔ کیا بات ہے۔ مجھے بتاتے کیوں نہیں پتا جی آج تو گھر میں رت جگا ہونا تھا۔ سارے گاؤں کی لڑکیاں ......" وہ اپنی بہن کی طرف مڑا۔ "کیوں کنتل۔ ؟"

کنتل نے کوئی جواب دیئے بغیر منہ موڑ لیا۔ اور چپکے سے کمرے سے باہر نکل گئی۔

حیران اور پریشان ہو کر رونق سنگھ تخت پر اپنے باپ کے قریب بیٹھ کر اُس کا منہ تکنے لگا۔

اُس کے باپ نے اپنی پگڑی اُتار کر تخت پر رکھ دی۔ ایک انگوچھے سے پسینے سے بھرا ہوا اپنا منہ اور سر صاف کرنے لگا۔ اس کے ہونٹ کانپ رہے تھے۔ اور آنکھیں نم تھیں۔ اس نے اپنا مضبوط ہاتھ اپنے بیٹے کے کندھے پر رکھ دیا اور دھیرے سے بولا۔

"اپنا دل پتھر کا کر لو رونق۔ !"

رونق چپ چاپ اپنے باپ کی طرف دیکھتا رہا۔

"ساوتری کل رات اپنے کسی آشنا کے ساتھ گھر سے بھاگ گئی۔ شادی کے سارے زیور لے کر۔ !"

یکایک رونق سنگھ کا جبڑا بھنچ گیا۔ گردن تن گئی۔ اس کے ہاتھوں کی انگلیاں بڑی سختی سے تخت کے کونے پر جم گئیں۔ اس کی سانس تیزی سے چلنے لگی۔ مگر وہ کچھ بولا نہیں۔ !

چند طویل لمحوں کے لئے بڑی تکلیف دہ خاموشی رہی۔

پھر رونق سنگھ نے پوچھا۔

"گھمرو سامان لے کر آگیا باپو۔؟"

"کوئی ایک گھنٹہ ہوگیا ــــــــــ!" باپ نے جواب دیا۔

دیوان خانے کے باہر دروازے سے لگی کنتل کو آواز دے کر رونق سنگھ نے بڑی سختی سے کہا۔

"کنتل، گھمرو کو کہو۔ میرا سامان لے کر دیوان خانے میں آئے۔"

جب رونق سنگھ کے ٹرنک اور سوٹ کیس اندر آگئے تو اس نے جیب سے چابیوں کا ایک گچھا نکال کر ٹرنک کھولا۔ اب اس کی ماں اور بہن دونوں دیوان خانے میں آچکی تھی۔ اور دھیرے دھیرے اس کی طرف بڑھ رہی تھیں۔

ٹرنک کھول کر، دھیرے سے آہستہ سے سنبھال کر ایک ایک چیز الگ کرتے ہوئے رونق سنگھ گنانے لگا۔

"یہ ساڑیاں ہیں، یہ غرارے، یہ بیل باٹ، یہ کنگن، یہ چوڑیاں، یہ جھمکے یہ گلوبند، یہ جھومر۔!"

صوبیدار رونق سنگھ اپنی ہونے والی بیوی کے لئے بہت کچھ لایا تھا۔ اپنی ماں کو سب کچھ ٹھیک طرح سے بتا کر اس نے ٹرنک بند کیا۔ اور چابی ماں کے ہاتھ میں دے کر بولا۔

"انہیں رکھ لو۔ کنتل کی شادی میں کام آئیں گی۔"

"مگر ــــــ!" ماں بولی۔ مگر بیٹے کا منہ دیکھ کر فوراً ہی چپ ہوگئی۔

رونق سنگھ نے دیوار سے لگی رائیفل اٹھائی۔ جُھک کر ماں کے پاؤں چھوئے اور کمرے سے باہر جانے لگا۔

ماں چلّا کر بولی۔ "بیٹا کہاں جارہے ہو۔؟"

رونق ذرا اُرکا۔ ذرا مُڑا۔ آہستہ سے بولا۔ "چھٹّی کینسل کرکے واپس فوج میں جارہا ہوں۔"

"بیٹا ـــــــ!" ماں کہتے ہوئے آگے بڑھی مگر باپ نے روک دیا۔ اور رونق پیچھے دیکھے بغیر مضبوط قدموں سے باہر نکل گیا۔

پھر اس کے باپ نے پگڑی سر پر رکھ لی اور آنکھ سے ایک آنسو پونچھا اور کاغذات دیکھنے میں مصروف ہوگیا۔

●

○
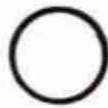
وہ رات تو میں نے جیسے تیسے کر کے رونق سنگھ کے گھر میں ہی گزاری۔ میں نے رونق سنگھ کو روکنے کی کوشش نہیں کی۔ اس کا غم اور غصہ، مایوسی اور حسرت ناکی کو دیکھ کر اس کے بپھرنے کی کیفیت کا اندازہ کر کے اسے روکنا غلط بھی ہوتا۔ پھر یہ بات بھی تھی کہ جب اس کے گھر والوں نے اسے روکنے کی کوشش نہیں کی تو میں روکنے والا کون ہوتا تھا۔ اور کس طرح اسے ڈھارس دے سکتا تھا۔

علی الصبح کسی کے جاگنے سے پہلے میں اپنا ہینڈ بیگ لے کر اس خاموش افسردہ گھر سے رخصت ہو گیا۔ گاؤں والوں سے کواڑی قلعہ کا راستہ پوچھ کر گاؤں کی چوحدی سے باہر نکل گیا۔

کواڑی قلعہ کو جانے والا راستہ دراصل راستہ نہ تھا۔ ایک طرح کی چرواہوں کی پگڈنڈی تھی۔ جو کہیں جھاڑیوں میں گم ہوتی، کہیں رتیلے

میدانوں میں تبدیل ہو جاتی۔ میں بھولتا بھٹکتا اپنے راستہ پر چلتا رہا۔ محض اٹکل سے۔ کیونکہ یہاں دُور دُور تک آبادی کا نشان نہ تھا۔ دو ایک جگہ چرواہوں کے گلے ضرور ملے اور اُن چرواہوں سے راستہ معلوم کرنے میں بھی کچھ مدد ملی۔ اور کچھ نے جو راستہ بتایا اس نے میلوں بھٹکا دیا۔ رونق سنگھ نے بتایا تھا کہ پارپیا سے کواڑی قلعہ دس کوس کے فاصلہ پر ہے مگر یہ دس کوس تھے کہ کسی طرح ختم ہونے میں نہیں آتے تھے۔ میں نے سمجھا۔ میں ضرور راستہ بھٹک گیا ہوں۔

اب سہ پہر قریب آ رہی تھی اور بھوک نے مجھے بے حال کرنا شروع کر دیا تھا۔ بالآخر راستہ میں ایک شوالہ نظر آیا۔ ایک اونچے ٹیلے پر اور چاروں طرف ہرے بھرے درختوں سے گھرا ہوا۔ میلوں تک پھیلی ہوئی سوکھی سڑی سی جھاڑیوں کے بعد جو یہ ہریالی دیکھنے کو ملی تو آنکھوں میں ٹھنڈک اترنے لگی اور میں بے اختیار اس شوالے کی طرف بڑھتا چلا گیا۔

کہیں بانسوں کے جھنڈ، کہیں آموں کے، کہیں جامن کے، کہیں نیم کے گھنیرے سائے۔ پھر ٹیلے کی ایک دراڑ سے چٹانوں میں گھرا ہوا ایک جھرنا نظر آیا۔ ٹھنڈا ٹھنڈا نرمل پانی۔ میں بار بار اسے آنکھوں سے لگاتا رہا۔ اور ہاتھ منہ دھوتا رہا۔ پانی میٹھا اور مزیدار تھا۔ جی بھر کر پیا۔ مگر پیاس کبھی بھوک کا بدل ثابت نہیں ہوتی۔ پانی پی کر بھوک اور چمک اٹھی۔ غلطی کی، گاؤں سے ہیں ناشتہ کر کے چلتا۔ یا چار روٹیاں سفر کے لئے بندھوا لیتا۔

"بہت دُور سے آئے ہو۔؟" یکایک ایک آواز میرے سر کے اوپر سے ابھری اور میں نے چونک کر اپنی بھیگی ہوئی آنکھوں سے اُدھر دیکھا، جدھر سے

آواز آئی تھی۔

میرے سر کے اوپر شوالے کا پجاری کھڑا تھا۔ اونچا، لانبا، گورے رنگ کا پُجاری۔ سر منڈا ہوا، پیشانی کشادہ۔ آنکھیں غلافی۔ چوڑا چکلا سینہ کمر میں ایک سفید دھوتی اور پاؤں میں کھڑانویں۔

میں نے پُجاری کو دیکھ کر ہاتھ جوڑ دیئے اور بولا۔ "ہاں۔ بہت دُور سے آرہا ہوں۔ کلکتہ سے آرہا ہوں۔"

"کہاں جاؤگے۔؟"

"کواڑی قلعہ سے آگے۔ سربھنی کے علاقہ میں۔!"

"تب تو کچھ بھٹک گئے تم۔"

"کیسے۔؟"

پُجاری نے مجھے راستہ بتایا۔ "جس راستہ سے تم آئے ہو۔ واپس راستے سے ڈیڑھ دو میل جاکر تمہیں ایک سوکھا نالہ ملے گا۔!"

"ہاں ملا تھا راستہ میں۔!"

"اسی نالے کے کنارے کو پکڑ لو پورب کی سمت چلتے جاؤ۔ شام ہوتے ہوتے کواڑی قلعہ پہونچ جاؤگے۔"

"مگر پجاری جی مجھے تو سخت بھوک لگی ہے۔"

"تو اشنان کرکے بھگوان کے درشن کرلو پھر تمہیں بھوجن ملے گا۔"

بھگوان کے درشن کے بعد دال بھات کھانے کو ملا۔ پتلی دال اور لبڑ گڈّا چاول۔ مگر بھوک اتنی تیز تھی کہ پتّل تک چاٹ گیا۔ پجاری کھڑا مسکراتا

رہا۔ جب اس کا شکریہ ادا کر کے چلنے لگا تو اس نے پوچھا۔

"کیا راستے میں تمہیں مرہٹے ملے تھے۔؟"

"مرہٹے۔؟" میں نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔ "کون سے مرہٹے۔؟"

اس نے میرے سوال کا جواب نہ دیا۔ اپنی غلافی آنکھوں سے آسمان کیطرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"مرہٹے آرہے ہیں۔!"

پھر رک کر کہنے لگا ——— "تم سربھنی جا رہے ہو۔ وہاں کے ٹھگوں سے ہوشیار رہنا۔"

"مگر پجاری جی ٹھگ تو ایک عرصہ ہوا ختم ہو چکے۔"

"ختم نہیں ہوئے۔!" وہ پجاری افسردگی سے سر ہلا کر بولا۔ "ابھی اس علاقے میں باقی ہیں۔ سربھنی کے جنگلوں سے ہوشیار رہنا۔"

وہ عجیب خوابناک نگاہوں سے میری طرف دیکھنے لگا۔ مجھے تو وہ پجاری کچھ پاگل سا لگا۔ میں نے جلدی جلدی اس خوب صورت شوالے کے خوبصورت پجاری سے اجازت چاہی اور اپنے راستہ پر ہولیا۔

ڈیڑھ دو میل واپس جا کر جب وہ سوکھا نالہ مجھے پھر ملا تو میں اس کے کنارے کنارے پورب کی طرف ہولیا۔ دھیرے دھیرے دھرتی بلند ہونے لگی۔ اور سوکھی جھاڑیوں کی جگہ ہری جھاڑیاں اور ہری جھاڑیوں کے بیچ بیچ کہیں کہیں تناور درخت نظر آنے لگے۔

اب سوکھے نالے میں کہیں کہیں چٹانوں کے فطرتی بندھ میں رکا ہوا پانی

بھی نظر آنے لگا۔

نالہ بلند ہوتا جا رہا تھا۔ دھیرے دھیرے اردگرد ایک پہاڑی سلسلہ سا نمودار ہونے لگا۔ میں نے کنارہ چھوڑ دیا اور نالے کے بیچوں بیچ پتھروں پر پھلانگتا ہوا راستہ طے کرنے لگا۔

اَب نالے کے دونوں کنارے سکڑتے جا رہے تھے اونچی چڑھائی شروع ہو گئی تھی۔ میرے سامنے نالے کا ایک موڑ تھا۔ خطرناک اور پتھریلا۔ اور دونوں طرف ڈھاک کے پیڑوں سے اس قدر گھرا ہوا کہ موڑ کے آگے کا سرا نظر نہ آتا تھا۔

موڑ کاٹ کر جیوں ہی آگے بڑھا تو ایک دم ٹھٹک کر رہ گیا۔ پہلے تو میرے کانوں میں آبشار کی آواز سنائی دی۔ پھر چار قدم موڑ کاٹ کر جو آگے بڑھا تو میرے سامنے ایک دم اونچی چٹانوں کی ایک قدرتی دیوار دکھائی دی۔ جس کے بیچ میں سے ایک آبشار پھوٹ کر نیچے گر کر آبشار کا پانی چٹانوں سے کٹ کر پورب سے دکھن کی طرف کٹ جاتا تھا۔ جس کی وجہ سے پورب سے پچھم کو بہنے والا نالہ سوکھا رہ جاتا تھا۔

اور ان چٹانوں کی دیوار کے عین اوپر سب سے اونچی بلندی پر کواڑی قلعہ کی جیّد دیواروں کے کھنڈر ٹوٹے پھوٹے کنگورے اور برجیاں بھی نظر آ رہی تھیں۔

ہاں بائیں طرف مجھے ایک پتلی سی پگڈنڈی نظر آئی جو اوپر قلعہ کی ایک ٹوٹی دیوار تک جاتی تھی۔ یہ پگڈنڈی بھی خاصی خطرناک تھی۔ مگر راستہ میں

جگہ جگہ چٹانوں کے بیچ چھوٹی چھوٹی جھاڑیاں یا بیلیں اُگی ہوئی تھیں جن کا سہارا لے کر میں اوپر جا سکتا تھا۔

دھیرے دھیرے کوشش کرتا ہوا کسی چھپکلی کی طرح میں اُوپر کی طرف سرکنے لگا۔ دل میں طرح طرح کے خیال آ رہے تھے۔ عجیب پاگل ہوں میں۔ کلکتہ چھوڑ کر اس ویرانے میں کیوں گھس رہا ہوں۔ اور وہ بھی ایک بیوقوف سیٹھ کے کہنے پر۔ جنگل سے یہ محبت کیا ایک طرح کا فرار نہیں ہے۔ زندگی کے کڑے امتحان سے بچنے کے لئے۔ مگر تم زندگی سے بچ کیسے سکو گے۔ جہاں جاؤ گے، زندگی تمہارا پیچھا کرے گی۔ اور اپنا خراج طلب کرےگی مسٹر۔ سوچتے سوچتے پاؤں لڑکھڑائے اور ایک جھاڑی کی شاخ ٹوٹ گئی۔ اور میں چند فٹ نیچے کھسکا مگر پھر پاؤں کے تلے ٹکنے کی جگہ مل گئی اور ہاتھ میں پیپل کا ایک چھوٹا سا تنا آ گیا۔ جو ایک چٹان کی دراڑ سے پھوٹ نکلا تھا۔ زندگی اسی طرح چٹان کاٹ کر پیدا ہو جاتی ہے۔ اس سے کہاں تک بچ سکو گے۔

گھٹنے چھلے، ہاتھ زخمی ہوئے مگر اوپر کھسکتا لڑھکتا۔ گرتا پڑتا کسی طرح قلعے کی اس ٹوٹی دیوار تک پہونچ گیا۔ جہاں پر یہ پگڈنڈی ختم ہوتی تھی۔

اَب آبشار کی آواز بہت کم ہو گئی تھی۔ اور میرے سامنے ایک نیا ہی منظر تھا۔ یکایک نگاہ ایک کھلی وادی کا نظارہ پیش کر رہی تھی۔ جس کے پرے ہرے بھرے جنگلوں کو لے کر ایک پہاڑی سلسلہ اس وادی کا احاطہ کر لیتا تھا۔ دُور پہاڑی سلسلہ سے نکلتی ہوئی ایک ندی اس اونچی وادی کے دامن میں پھیلتی جا رہی تھی۔ اور اس وادی کے شمال میں کھریا مٹی سے لپا ہوا ایک سفید

گھر نظر آرہا تھا۔ جس کے ایک طرف جنگل اور تین طرف کھیت ہی کھیت۔!

سیٹھ نے ٹھیک ہی کہا تھا۔

واقعی بے حد حسین جگہ ہے۔

جہاں فطرت کی گود میں ساری زندگی بتائی جا سکتی ہے۔

میں دیر تک اس سحر انگیز وادی کی طرف دیکھتا رہا۔ آس پاس قلعہ کے کھنڈروں سے بے نیاز۔

یکایک میرے قریب کوئی ہنسا۔

میں نے چونک کر اِردگرد نظر ڈالی۔

میرے دائیں طرف قلعہ کی ایک ٹوٹی محراب سے لپٹ کر بیری کا ایک جھاڑ سر بلند ہو گیا تھا۔ اور یہاں پر اس کی ایک شاخ کو تھامے ایک لڑکی کھڑی ہوئی تھی۔ بیر کھاتے کھاتے میری طرف دیکھ کر ہنس رہی تھی اور مجھ سے کہہ رہی تھی۔

"بیر بہت میٹھے ہیں۔ کھاؤ گے۔؟"

اس نے دو چار بیری میری طرف اچھال دیئے۔ ایک بیر میری ناک پر لگا اور دو گالوں پر، دو تین میرے ماتھے سے ٹکرا کر زمین پر گر گئے۔ مگر میں بھونچکا ہو کر اس لڑکی کو دیکھتا رہا۔

وہی لڑکی تھی۔ سادتری۔ مگر تصویر سے دس گنا زیادہ حسین۔

●

○

کچھ دیر تک تو میں ٹکٹکی باندھے اُسے دیکھتا رہا، خاموش نگاہوں سے اور ہوا بیری کے پتوں سے اُلجھ کر سرسراتی رہی اور ساوتری کے کھلے بالوں کو اس کے شانوں پر جھلاتی رہی اور وہ خاموشی سے میرے سامنے کھڑی رہی ہاتھ میں بیر لئے اور بڑی بڑی آنکھوں میں شوخی کی چمک لئے۔ پھر قریب ہی کہیں کوئی فاختہ پھڑ پھڑا کر اڑ گئی۔ اور وہ سکوت کا وقفہ ٹوٹ گیا۔

میں نے اس سے پوچھا۔ ـــــــ "تم ساوتری ہو۔؟"

"ساوتری۔؟ کون ساوتری۔؟"

"بنو مت ـــــ!" میں نے کسی قدر غصہ میں آکر اس سے کہا۔

"تم ساوتری ہو۔ میں نے تمہاری تصویر دیکھی ہے۔ تمہاری شادی پاریپا کے رونق سنگھ صوبیدار سے لگی تھی۔ مگر شادی سے دو روز قبل تم اپنے آشنا کے سنگ بھاگ آئیں۔"

اس لڑکی کے چہرے کا چمپئی رنگ سرخ ہوتا گیا۔ آنکھوں میں جہاں پہلے حیرت تیر رہی تھی۔ وہاں اب ایک خشمگیں چمک دوڑنے لگی۔ اس نے جھک کر ایک پتھر اٹھالیا۔

بولی ـــــ "تم کون ہو، مجھ پر ایسے جھوٹے الزام لگا رہے ہو۔ نہ میں کسی کے گھر سے بھاگ کر آئی ہوں، نہ میں پار پیا کے کسی رونق سنگھ کو جانتی ہوں۔"

"تو تم ساوتری نہیں ہو۔؟" میرا یقین ڈگمگانے لگا تھا۔ کیونکہ لڑکی کے انکار میں بڑی شدّت تھی۔

"نہیں۔ میں تو ریکھا ہوں اور میری شادی تو پانچسال پہلے جبیر آباد ضلع میں ہو چکی ہے۔ اور میرا ایک بچّہ بھی ہے۔ اور یہاں میں اپنی ماں کے پاس آئی ہوں۔"

"یہاں کہاں۔؟"

لڑکی کا بوٹا سا قد ذرا سا اپنی جگہ سے مُڑ گیا۔ انگلی کے اشارے سے وہ وادی کے گھر کی طرف اشارہ کر کے بولی۔

"وہ گھر دیکھتے ہو۔ وہ ہمارا ہے۔ وہ ـــــ دو منزلہ گھر۔!"

اتنا کہہ کر پھر میری طرف پلٹی اور اس کے اس طرح مڑنے اور پلٹ آنے میں اس کے سینے کے حباب مچل مچل گئے۔ میرا دل بھی مچلنے لگا۔

"تو تم سربھنی کی وادی کی مالکن ہو۔؟"

"مالکن تو میری ماں ہے۔"

"سرجی اماں۔؟"

اس لڑکی کے پتلے سُرخ ہونٹ ذرا سے کھلے اور اس میں چمپیلی کے غنچے نظر آنے لگے۔ وہ حیرت زدہ ہو کر بولی۔

"تم میری اماں کا نام کیسے جانتے ہو۔؟ تمہیں تو میں نے اس علاقہ میں آج تک نہیں دیکھا۔ اور میری ماں کا نام سُرجی نہیں ہے۔ سُرجا دیوی ہے۔"

"میں نے آجتک اس علاقہ میں اس سے پہلے کبھی قدم نہیں رکھا۔ ایک سیٹھ نے مجھے تمہاری ماں کا نام بتایا تھا۔ یہ بھی بتایا تھا کہ وہ ایک بیوہ ہے۔ اور اپنی زمین بیچ کر اپنی لڑکی کے سُسرال جانا چاہتی ہے۔"

"یہ تو سچ ہے۔" لڑکی سر ہلا کر بولی۔ اور اب اس کی نگاہوں میں میرے لئے جو شک وشبہ تھا وہ بھی دُور ہوتا دکھائی دینے لگا۔

"تو کیا تم زمین خریدنے آئے ہو۔؟"

"زمین خریدنے نہیں۔ زمین دیکھنے آیا ہوں۔ اگر پسند آگئی۔ اور بھاؤ ٹھیک ہوا تو خرید بھی لوں گا۔ مگر اب تمہیں دیکھ کر جی چاہ رہا ہے کہ میں بھی جیر آباد میں جا کے بس جاؤں۔"

"چھی۔!" وہ لڑکی ذرا نخوت سے بولی۔ مگر خوش ہوئی۔ چہرے پر تنفّر اور غصّہ عارضی تھا۔ ہر عورت اپنی تعریف سے خوش ہوتی ہے۔ چاہے وہ شادی شُدہ ہی کیوں نہ ہو۔؟"

"میرا شوہر بڑا ظالم ہے۔ جیر آباد میں تم نے مجھے ایسی ویسی نظروں سے دیکھا تو تمہاری جان لے لے گا۔"

"بہت دیکھے ہیں جان لینے والے۔" میں اس کے قریب جانے لگا۔ اس

نے ہاتھ میں اٹھائے ہوئے پتھر سے نشانہ بنانا چاہا۔ میں رُک گیا۔

"مجھے اب بھی یقین نہیں آتا کہ تم ساونری نہیں ہو۔ عین بین وہی صُورت ہے۔ کیا دو لڑکیاں ایک ہی صُورت کی ہو سکتی ہیں۔؟ اتنی گہری مُشابہت۔ کہیں تم مجھے دھوکا تو نہیں دے رہی ہو۔؟"

"تم ہمارے گھر چل رہے ہونا۔ میری ماں سے بات کرو گے نا۔ سب معلوم ہو جائے گا۔ میں کون ہوں۔؟"

سُورج غروب ہونے لگا۔ سائے بڑھنے لگے۔ اور قلعہ کے کنگوروں اور بُرجیوں کے سُلہوٹ نمایاں ہونے لگے۔ ہوا میں خنکی بڑھنے لگی۔ اور خنکی کے ساتھ سر بھنی کے جنگلوں سے آنے والی خوشبو بھی آنے لگی۔

وہ میرے ساتھ چلنے لگی۔

وہ میرے ساتھ ساتھ بڑے لااُبالی انداز میں چلنے لگی۔ گلابی اوڑھنی کے نیچے کس کر بندھی ہوئی پیلی انگیا اور اس کے کڑھا ہوا سرخ گھاگھرا۔ جس کے آم کے پتوں والی کشیدہ کاری میں آئینے جڑے ہوئے تھے۔ آئینوں کے وہ چھوٹے چھوٹے چوکور ٹکڑے بھاگتے ہوئے سُورج کی روشنی کے انعکاس سے چمک اُٹھتے۔ چہرے پر کندن کی سی ضیا۔ وہ متناسب اعضا والی بوٹے سے قد کی لڑکی تھی۔ کسی طرح وہ ایک بچّہ کی ماں نہیں معلوم ہوتی تھی۔ کسی طرح وہ پانچ سال کی بیاہتا نہیں معلوم ہوتی تھی۔ کسی طرح سولہ، سترہ سال سے زیادہ عمر کی نہیں معلوم ہوتی تھی۔ چلتے چلتے اس کا گھاگھرا میرے پاؤں سے چھو جاتا یا اس کی اوڑھنی کسی کانٹے دار شاخ سے اُلجھ جاتی میں اُسے

آہستہ سے الگ کر دیتا۔ اور وہ میرا شکریہ ادا کئے بغیر اوڑھنی سنبھال کر چلنے لگتی۔

عجیب دلکش والہانہ سی چال تھی اس کی۔ میں تو راستہ بھر اُسے دیکھتا ہی رہ گیا۔ مجھے یہ نہیں معلوم ہوا کہ کب سورج غروب ہو گیا۔ کب شفق کی لالی نیلگوں کانچ کی سطح میں تبدیل ہو گئی۔ کب نیلگوں کانچ پر سرمئی لہریں دوڑنے لگیں۔ کب دھوپ کا جال وادی سے اٹھ کر افق کے اس پار گم ہو گیا۔ کب شام کے سرسراتے سایوں نے تاریکی کا جامہ پہن لیا۔ بس مجھے اتنا معلوم ہے کہ جب اس کے گھاگھرے کی گہری سرخی گہری تاریکی میں تبدیل ہو گئی اور اس تاریکی میں وہ چوکور آئینے کبھی کبھی جانے کہاں سے روشنی پا کر جھلملانے لگتے۔ تب میں نے سمجھا رات ہو گئی۔

چلتے چلتے وہ کبھی ایسی گہری سانس کھینچتی جو کسی دکھے ہوئے دل کے بہت قریب معلوم ہوتی۔ میں چونک کر اس کے چہرے کی طرف دیکھنے کی کوشش کرتا۔ مگر اس کا چہرہ تاریکی میں تھا۔ میں کچھ معلوم نہ کر سکا۔

میں نے اس سے پوچھا۔

"تم اتنی دور قلعہ کے کھنڈروں میں کیوں آئی تھیں۔؟"

"بیر کھانے آئی تھی۔"

"بیر تو تمہاری وادی میں بھی ملتے ہوں گے۔؟"

"ملتے ہیں، مگر اتنے میٹھے نہیں ہوتے۔"

میں چپ رہا۔ پھر تھوڑی دیر کے بعد بولا۔

"نہیں، یہ بات نہیں ہے۔"

وہ ایک آہ بھر کے بولی۔

"نہیں، یہ بات نہیں ہے۔ میں قلعہ کے کھنڈر میں اس لئے آتی ہوں کہ ویرانے میں میرا دل بہت لگتا ہے۔"

"کیا تم بھی میری طرح ویرانے کی عاشق ہو۔؟" میں اس کے جواب پر چونک کر کہنے لگا۔

اس نے اس بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ خاموشی سے چلتی رہی۔

کچھ دیر کے بعد ایک ڈھلان سے ہم دونوں گزرنے لگے۔ وہ آگے آگے اور میں پیچھے پیچھے۔ تھوڑی دیر کے بعد پانی کا شور سنائی دینے لگا۔ ایک جگہ پر وہ رک گئی۔ یہاں تاریکی بہت تھی۔ کچھ منظر نہ آتا تھا۔

وہ بولی۔ "اپنا ہاتھ میرے ہاتھ میں دو۔!"

"کیوں۔؟"

"یہاں پر نالے کا پانی بہت تیز ہے اور اُس نالے کے اوپر تین درختوں کو گرا کر ہم لوگوں نے ایک پُل باندھ رکھا ہے۔ مگر ٹیڑھا اور ٹیڑھا پُل ہے اور درختوں کے تنے جگہ جگہ سے ہلتے بھی ہیں۔ میں تو آنکھ بند کر کے اس پُل پر سے گزر سکتی ہوں۔ مگر تم اگر ذرا بھی ڈگمگائے تو نالے کے تیز بہتے ہوئے پانی میں گر جاؤ گے۔ اور پھر تمہاری ہڈی پسلی تک نہیں ملے گی، پانی اتنا تیز ہے۔!"

میں نے اس سے پوچھا۔ "کیا تمہیں اس اندھیرے سے ڈر نہیں لگتا۔؟"

"نہیں۔" وہ سرگوشی کے لہجہ میں بولی۔

"اندھیرا تو مجھے بہت پسند ہے۔ اندھیرا تو میری تقدیر ہے۔"
میں چپ رہا۔ سوچنے لگا۔ یہ لڑکی بڑی رومانٹک معلوم ہوتی ہے۔ اکثر اس عُمر میں لڑکیاں اسی طرح رومانٹک ہو جاتی ہیں۔ اور شوہر اور بچّے اور گھر رکھتے ہوئے بھی کسی موہوم رومانس کی تلاش میں آہیں بھرا کرتی ہیں۔
میں نے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دیا۔ وہ میرا ہاتھ پکڑ کر آگے چلنے لگی۔
ہمارے قدم اب تراشیدہ درختوں کے پُل پر تھے اور نیچے نالے کا شور بہت بڑھ گیا تھا۔ اور اس تاریکی میں بھی کہیں کہیں اس کا سفید جھاگ تیزی سے بہتا ہوا نظر آجاتا۔ لڑکی بڑے مضبوط قدموں سے چل رہی تھی۔ اور اس کے نرم و نازک ہاتھ کی مومی انگلیاں میرے دل میں شمعیں جلا رہی تھیں۔ پھر ہم نے پُل پار کر لیا۔ اور ایک چڑھائی چڑھنے لگے۔ پانی کا شور کم ہوتا گیا۔ اور درختوں کی سائیں سائیں تیز ہوتی گئی۔ اب ہم ایک سطح مرتفع پر تھے۔ یہاں پر وادی پھیل کر ایک میدان کی صورت اختیار کر چکی تھی۔ ہم دونوں درختوں کے ایک کنج میں کھڑے تھے۔ اور سامنے کوئی دو گز کے فاصلے پر وہ دو منزلہ پختہ گھر تھا جس کے اندر روشنیاں جھلملا رہی تھیں۔
ریکھا نے میرا ہاتھ چھوڑ دیا۔ بولی۔ "میں جاتی ہوں۔"
"کہاں۔؟"
"اپنے گھر۔"
"اور میں۔؟"
"تم بعد میں آدھے گھنٹہ کے بعد آنا۔"

"کیوں۔؟"

"اتنی رات گئے، میرے گھر والے مجھے کسی اجنبی کے ساتھ دیکھیں گے تو کیا کہیں گے۔ اس لئے تم آدھے گھنٹے کے بعد، نہیں ایک گھنٹہ کے بعد آنا۔"

"آؤگے نا۔؟" اس نے عجیب دردمندی سے مجھ سے پوچھا۔"ضرور آؤگے نا۔؟"

اس کے دل کا کرب کہیں پر اندر سے مجھ سے چھو گیا۔ میں نے آہستہ سے کہا۔

"آؤں گا کیوں نہیں۔ بھلا اس اندھیری رات میں اور جاؤں گا بھی کہاں۔؟"

وہ میرا ہاتھ چھوڑ کر اندھیرے میں گم ہو گئی۔ چند قدم پر جیسے اندھیرے میں جذب ہو گئی۔ میں ایک پتھر پر بیٹھ گیا۔ ہینڈ بیگ سے ایک چھوٹا سا تولیہ نکال کر میں نے اپنا چہرہ صاف کیا۔ اپنے ریڈیم واچ سے وقت دیکھا۔ ابھی تو سات ہی بجے تھے، ہاں مگر پہاڑوں پر رات بہت جلدی ہی آجاتی ہے۔ بیٹھے بیٹھے میں نے آبھا کے بارے میں سوچا۔ اسے شاید کوئی دوسرا مرد مل گیا ہوگا۔ ایسی تیز رفتار دنیا ہے۔ آجکل کوئی کسی کے انتظار میں بیٹھا نہیں رہتا۔ محبّت کو بھی جیٹ کے پَر مل گئے ہیں۔ آج کل محبّت ایک ایئر ہوسٹس کی طرح ہے، جو ہر آنے جانے والے مسافر کو اپنی مسکراہٹ پیش کرتی ہے۔ چند گھنٹے ہر مسافر کے ساتھ چلتی ہے۔ جسکی پوری مسافت ایک پوری زندگی کی طرح ہے۔ وہ ایک بیوی کی طرح چائے بھی پلاتی ہے۔

لنچ بھی کھلاتی ہے. جھوٹے برتن بھی اٹھاتی ہے۔ آپ کی گردن کے نیچے تکیہ بھی رکھتی ہے. جو اکثر بیویاں نہیں رکھتیں۔ پھر سفر ختم ہونے کے بعد وہ اس طرح ہاتھ ہلاتی ہے۔ جیسے آپ روزمرّہ کی طرح گھر سے دفتر جارہے ہیں۔ حالانکہ شاید پھر کبھی آپ دونوں کو ملنے کا موقع نہیں ملے گا. تو کیا ہوا. پھر کوئی دوسرا جیٹ ہے. کوئی دوسری ایر ہوسٹس. یا وہی جیٹ اور وہی ہوسٹس مگر کوئی دوسرا مرد۔

ہوائی جہاز کے سفر میں ایک کشش یہ بھی ہے۔ ہر مسافر کو چند گھنٹوں کے لئے اپنی پسند کی بیوی مل جاتی ہے۔ خوب صورت، خدمت گار، کم گو اور ہمیشہ متبسّم، فالتو پریم سے میں کبھی نہیں گھبرایا. مگر کہیں اندر جاکر دل کے بہت اندر جاکر کہیں پر ہمیشہ کے لئے ٹِک جانے کا احساس بھی چُھپا ہوا ہے. جانے کیوں۔ ؟

حالانکہ یہ مرد کی فطرت نہیں ہے۔ مگر آجکل تو عورت کی فطرت بھی بدلتی جارہی ہے۔ یوں سوچتا ہوں کہ مرد اور عورت کو اگر یکساں مواقع ملیں تو دونوں کی فطرت یکساں ہو جاتی ہے ۔ اس میں آبھا کا بھی کیا قصور ہے۔ ؟ شاید وہ مجھ سے زیادہ سچی اور حقیقت پسند ہے۔

پھر سونے پن اور کسی ویرانے کی تلاش کے لئے کسی جنگل میں جانے کی کیا ضرورت ہے۔ آجکل ہر شہر جنگل ہے۔ ہر گلی ویرانہ ہے۔ لاکھوں کی بھیڑ میں چلنے والا اکیلا ہے۔ آجکل کی شہری زندگی میں کہیں پر کوئی تار آدمی اور آدمی کے درمیان ٹوٹ چکا ہے. شاید اسے ڈھونڈھنے کے لئے درختوں

کے پاس جانا ضروری ہے۔

سوچتے سوچتے ایک گھنٹہ یوں گزر گیا کہ پتہ بھی نہیں چلا۔ گزرگاہِ خیال میں یہی تو ایک خوب صورتی ہے۔ آدمی تھکتا نہیں ہے۔ مگر میں اب صبح کا چلا ہوا بے حد تھک گیا تھا اور سامنے گھر کی روشنیاں مجھے بلا رہی تھیں۔

●

○

حویلی کا بڑا دروازہ کھلا اور کسی نے لالٹین اُوپر اٹھا کر میرے چہرے پر روشنی ڈالی۔

"کون ہو تم۔؟" یہ ایک مُعمّر عورت کی آواز تھی۔

"ایک مُسافر ہوں۔ راہ بھٹک گیا ہوں۔ رات بھر کے لئے پناہ چاہتا ہوں۔"

"کہاں سے آئے ہو۔؟"

"پار پیا گاؤں سے۔!"

"اِدھر کیا کام ہے۔؟" اس معمّر عورت نے اب لالٹین نیچے کر لی تھی اور اب مَیں اس کا معمّر خاکستری رنگت والا چہرہ دیکھ سکتا تھا۔ جہاں منڈھی ہوئی کھال کہیں کہیں سبز رنگت کی سلوٹوں میں بدل چکی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے اُسے آج ہی کفن سے نکال کر لایا گیا ہو۔

"اوہ ہو۔ بیچارہ باہر کھڑا سردی میں ٹھٹھر رہا ہے۔" کوئی نوجوان لڑکی معمّر عورت کے پیچھے سے بولی۔

"بیچارے کو اندر آنے دو نا۔ داہلی بوا۔" میں نے آواز پہچان لی۔ یہ ریکھا کی آواز تھی۔

پھر ریکھا کے پیچھے ذرا دُور سے کسی تیسری عورت کی آواز آئی۔

"ریکھا بیٹی کون ہے۔؟"

"ماں ایک مسافر ہے۔ رات بھر کا آسرا چاہتا ہے۔!"

"اِسے آنے دو۔" اس عورت نے فیصلہ کن لہجہ میں کہا۔ اور میرے سامنے کھڑی معمّر عورت نے ہٹ کر مجھے راستہ دیدیا۔ مگر مکمّل رضامندی سے نہیں۔ منہ ہی منہ میں بُڈبُدا رہی تھی اور مجھے شُبہ کی نظروں سے دیکھتی جاتی تھی۔

آگے آگے ریکھا۔ اس کے پیچھے لالٹین اٹھائے ہوئے وہ معمّر عورت اور اس کے پیچھے میں چلا۔ یہ قافلہ ایک کھلے آنگن کو پار کر کے ایک صحن سے گزرا۔ صحن کو پار کر کے ایک تنگ و تاریک غلام گردش میں گھُسا۔ چند گز کے فاصلے پر روشنی نظر آئی۔ ایک بڑے دروازے سے ہم اندر آ گئے۔

یہ ایک بہت بڑا دیوان خانہ تھا۔ پرانے فرنیچر سے پٹا ہوا۔ فرنیچر کم سے کم سو سال پرانا ہوگا۔ جگہ جگہ تخت اور گاؤ تکیئے اور ایک پرانی چھپر کھٹ اور کلابتون کے پردے اور دیواروں پر پُرانی بندوقیں اور بارہ سنگھوں کے سر اور پرانے بزرگوں کی تصویریں اور دو بڑے بڑے بلّوریں جھاڑ۔ ہوا میں عہدِ پارینہ کی خوشبو تھی اور راجپوتی تلواروں کی جھنکار کی گونج۔ دیوان خانے کے

سازو سامان کو دیکھ کر لگتا تھا۔ کہ جیسے اس گھر نے کبھی اچھّے دن بھی دیکھے ہیں۔ اور کبھی ایسے خوفناک دن بھی جو یکایک تشدّد کی سرخی سے بھر گئے تھے۔

میں بہت حسّاس آدمی ہوں۔ دیوان خانے کو دیکھ کر ماضی کے ہیولے میری نظروں کے سامنے سے جیسے صاف صاف گزرنے لگے۔

مگر میں نے اپنے آپ کو سنبھال لیا کیونکہ میرے سامنے کالے کنارے کی سفید ساڑی پہنے ہوئے ادھیڑ عمر کی ایک خاتون تخت پر بیٹھی ہوئی پاندان کھولے ہوئے چھالیاں کتر رہی تھی۔ اور مجھے غور سے دیکھ رہی تھی۔ اس کے ناک نقشے اور چمپئی رنگت اور بدن کی مشابہت سے میں نے اندازہ لگایا کہ وہ ریکھا کی ماں ہوگی۔ اب بھی بہت خوب صورت تھی۔ کبھی بیحد خوبصورت رہی ہوگی۔

وہ بولی۔ "یہاں تو کوئی نہیں آتا، تم اِدھر کیسے بھٹک گئے۔ ؟"

اس کی نکیلی نگاہیں مجھے چُبھنے لگیں۔

میں نے کہا ـــــــ "سچ تو یہ ہے کہ میں بھٹکا نہیں ہوں۔ اِدھر آنے ہی کے اِرادے سے آیا تھا۔ ایک سیٹھ نے آپ کے گھر کا پتہ دیا۔ کچھ زمین خریدنے کا اِرادہ ہے۔ اگر مول بھاؤ ٹھیک سے ہو جائے۔!"

ریکھا کی ماں غور سے مجھے دیکھتی رہی۔ لمبے تکلیف وہ وقفہ کے بعد اس کے نازک خطوط والے چہرے کے بھاؤ نرم پڑ گئے۔ شیریں لہجہ میں بولی۔

"آدمی شریف لگتے ہو۔ تم سے مول بھاؤ ہو جائے گا۔"

پھر مڑ کر اس معمّر عورت سے بولی۔

"اِن کے لئے مہمان خانہ کھول دو۔ اور ان کے اشنان کے لئے پانی

رکھ دو۔ اور ریکھا تم میرے ساتھ چلو۔ لگتا ہے مسافر بستر بھی ساتھ نہیں لایا۔ میں
اندر سے پارچے دیتی ہوں۔"

ریکھا کی بڑی بڑی گہری سیاہ آنکھیں، ایک لمحہ کے لئے میرے چہرے پر رکیں۔ وہ پُرشوق، پُراسرار آنکھیں۔ پھر وہ مڑ کر اپنی ماں کے ساتھ چلی گئی۔

دیوان خانے سے ایک بڑا چوبی زینہ اوپر کی منزل کو جاتا تھا۔ داہلی بوا لالٹین لے کر آگے آگے چلی۔ ہم دونوں کے قدموں کی آواز سے دیوان خانہ گونج رہا تھا۔ کبھی اس بسیط چوبی زینے پر غالیچہ رہا ہوگا۔ اور گزرنے والے قدم بے آواز رہے ہوں گے۔ مگر اب تو چوبی زینے کی ساری چمک دمک غائب ہو چکی تھی۔ اور چلتے چلتے زینے کی سیڑھیاں چرچرا کر آواز بلند کرتی تھیں۔

زینہ چڑھ کر ہم بائیں طرف مڑے، پھر دائیں طرف۔ پھر ایک لمبی غلام گردش کے کونے پر رک کر داہلی بوا نے اپنے گھاگھرے میں لٹکے ہوئے چابیوں کا ایک بڑا گچھا نکالا اور ایک چابی لگا کر دروازہ کھول دیا اور لالٹین لے کر اندر آئی۔

لالٹین کی روشنی میں مجھے ایسا لگا جیسے میں کسی ہرے بھرے باغیچے میں ہوں۔ دیواروں پر ہرے ہرے پیڑوں، بیلوں کے نقش و نگار تھے۔ چھت بھی اسی طرح نقش تھی۔ دو کھڑکیاں تھیں۔ ایک دروازہ۔ ساتھ میں پرانی وضع کا ایک غسل خانہ۔ کمرے میں ایک جگہ چھپر کھٹ تھا۔ دوسری طرف دو تخت اور دو تپائیاں ایک کونے میں ایک قدِ آدم صراحی نما گل دان نیلگوں نقش و نگار سے آراستہ بہت پرانا بڑا بیش قیمت چینی کا گلدان۔

میں ابھی کمرے کا معائنہ کر رہا تھا کہ سرد جادیوی چھپر کھٹ پر بچھانے

کے لئے چادریں اور تکیئے کے غلاف لاکر داہلی بوا کو دے گئیں۔ داہلی بوا کے ہونٹ ابھی تک نخوت سے مڑے ہوئے تھے۔ اور ماتھا تیوریوں سے بھرا ہوا تھا۔ اور وہ اپنا سارا غصہ بستر کی چادروں کو ٹھیک کرنے میں نکال رہی تھیں۔

پھر ایک لمبی چوٹی اور میلی دھوتی والا نوکر ہاتھوں میں پانی کی دو بالٹیاں اٹھائے اندر آیا۔ ایک بالٹی سے دھواں اٹھ رہا تھا۔ کھولتا پانی ہوگا۔ اور دوسری بالٹی میں ٹھنڈا ہوگا۔

میں نے اس سے کہا۔ "مجھے ٹھنڈے پانی کی ایک بالٹی اور چاہیئے۔"

داہلی بوا کے نتھنے پھڑکے، منہ ہی منہ میں کچھ بُدبُدائیں، نوکر "اچھا" کہہ کر چلا گیا اور چند منٹ کے بعد تیسری بالٹی لاکر غسل خانے میں رکھ گیا۔ اتنے میں داہلی بوا نے تپائی پر رکھا ہوا ایک شمع دان روشن کر دیا۔

پھر مجھ سے منہ پھیر کر بولی۔ "جب کھانا تیّار ہوگا۔ آکر بول جاؤں گی۔"

میں کچھ نہ بولا۔ ہینڈ بیگ سے ایک جوڑا کپڑے نکال کر غسل خانے میں گھس گیا اور اچھی طرح غسل کیا۔

تھکا ہوا تو تھا ہی، غسل کے بعد غنودگی آنے لگی۔ چند منٹ آرام کرنے کی خاطر بستر پر لیٹ گیا۔ لیٹتے ہی معلوم نہیں کب سو گیا۔ معلوم نہیں کب کس نے ٹہوکا دے کر جگایا۔ ہڑبڑا کے اٹھا تو دیکھا رات گہری ہو چکی تھی۔ اور دیکھا میرے بستر کے قریب کھڑی مجھے جگا رہی ہے۔

"کب سے سو رہے ہو۔ اٹھو۔ کھانا بھی ٹھنڈا ہو گیا۔ سب کھا کے سو گئے۔"

میں نے کہا۔ "مجھے جگا دیا ہوتا۔"

"اماں نے منع کر دیا۔ بولیں، تھکا ماندہ آیا ہے۔ دو گھنٹے سو لینے دو۔"

میں اس کے پیچھے پیچھے چلا۔ دو تین کمروں کے دروازوں سے گزر کر ہم ایک چھوٹے سے کمرے میں داخل ہوئے۔

یہاں ایک چھوٹا سا کچن تھا۔ کھانا پکانے کے لئے نہیں، غالباً کھانا گرم کرنے کے لئے چند برتنوں میں ڈھکا ہوا کھانا رکھا تھا۔ اور ایک چولہے میں آگ سلگ رہی تھی۔ چولہے کے قریب بادامی رنگ کی ساڑی پہنے ریکھا کی ماں پھلکے اتار رہی تھی۔

"آپ نے بڑی تکلیف کی۔" میں نے کہا۔ "مجھے پہلے ہی جگا دیا ہوتا۔"

ریکھا کی ماں نے ایک تھالی کی کٹوریوں میں سالن نکالے اور گرم گرم پھلکے اُتار کر رکھے اور تھالی میری طرف کھسکا دی۔

دوسری تھالی اس نے ریکھا کو دی جو مجھ سے ذرا پیچھے بائیں طرف اس طرح بیٹھی تھی۔ کہ میں اس کے بالوں میں گھرے ہوئے رُخ کو دیکھ سکتا تھا۔

بڑی خاموشی میں کھانا کھایا گیا۔ میں کبھی تو کھانا کھاتا کیونکہ بہت بھوک لگی تھی۔ کبھی سمٹی سمٹائی اپنے قریب بیٹھی ریکھا کو کھانا کھاتے دیکھتا۔ اس کی آنکھوں میں بڑے گہرے سپنے جھانک رہے تھے۔ مجھے پورا منظر ہی ایک سندر سپنا سا لگتا تھا۔ کھاتے کھاتے کبھی نیند سے آنکھیں جھپک جائیں اور پل بھر کے لئے اندھیرا چھا جاتا۔ پھر آنکھیں کھولتا تو ریکھا کی ماں کے رخ پر شعلے ناچتے ہوئے دیکھتا۔ پھر ریکھا کی مومی انگلیاں دیکھتا۔ جو بڑے

سلیقے سے لقمہ اٹھا کر اپنے ہونٹوں تک لے جا رہی تھیں۔ ایک دفعہ دھیرے سے میری تھالی اس کی تھالی سے ٹکرا گئی۔ اور مجھے ایسا لگا جیسے اس نے اپنا ایک لقمہ توڑ کر میری تھالی میں رکھ دیا ہو۔ اور میں نے اسے اٹھا کر اپنے معدے میں نہیں اپنے دل کی اتھاہ گہرائیوں میں کہیں چھپا لیا ہو۔ اس نیم غنودگی کے عالم میں مجھے کچھ زیادہ یاد نہیں ہے کہ کیا ہوا۔ بڑی گہرے قرب والی خاموشی میں لرزتی پلکوں کے سائے میں جھکی جھکی آنکھیں تھیں۔ اور لقمہ توڑ کر ٹھٹھک جانے والی انگلیاں اور سانس ایسی مدھم گداز اور گہری جیسے آدھی رات میں رات کی رانی کے پھول کھلتے ہوں۔ کبھی دس برس میں کچھ نہیں ہوتا۔ کبھی آدھے لمحہ کی اونچی اُڑان میں ساری زندگی روشن ہو جاتی ہے۔

کھانا کھلا کے ریکھا نے میرے ہاتھ دُھلائے۔ پھر سروجا دیوی نے ایک شمعدان اٹھایا۔ آگے آگے ماں چلی، پیچھے پیچھے بیٹی، اس کے پیچھے میں، اس بوٹا سے قد والی لڑکی کی بڑی ڈولتی ہوئی چال تھی۔ نیند میں مدماتی چال۔ بڑے ٹھہرے گھماؤ۔ بڑے خطرناک خم کبھی بار میرا جی اسے اپنے بازوؤں میں اٹھا کر سمیٹ لینے کو چاہا۔ مجھے کچھ ایسا محسوس ہوا جیسے وہ ایک گڑیا کی طرح ان بازوؤں میں سما جائے گی۔ مگر میں نے اپنے آپ کو سنبھال لیا حالانکہ نیند تھی اور نشہ تھا۔ اور گہرے قرب والی خاموشی تھی۔ کوئی کچھ نہیں بولا۔ مگر جیسے بدن بدن کو بُلاوا دے رہا ہو۔!"

میرے کمرے کے قریب جا کر دونوں ماں بیٹی رک گئیں۔ ماں نے کہا۔

"آرام سے سوؤ۔ صبح دو گھوڑے تیار ملیں گے اور ریکھا تمہیں زمین دکھا دے گی۔!"

ریکھا کی نگاہیں اُوپر میرے چہرے کی طرف اٹھیں۔ ایک لمحہ کے لئے دو کوندے لپکے۔ پھر وہ آنکھیں جھک گئیں اور ریکھا کچھ کہے بغیر اپنی ماں کے پیچھے پیچھے چلی گئی۔

جب تک وہ اُوجھل نہیں ہوگئیں میں غلام گردش میں کھڑا انہیں دیکھتا رہا۔ پھر میں اپنے کمرے میں آیا۔ دروازہ اندر سے بند کیا۔ شمعدان کو گل کیا۔ اور دونوں کھڑکیاں کھول کر دُور سے آنیوالی جنگلوں کی ہواؤں کی سائیں، سائیں سُنتا سو گیا۔

جانے کب تک سوتا رہا۔ یکایک کسی وقت میں نے محسوس کیا کہ میرا دم گھٹ رہا ہے۔ اور میری گردن پر کوئی پھندا سا ہے جو میرا دم گھونٹ رہا ہے۔ یکایک میرا سارا جسم بیدار ہوگیا اور دوسرے لمحہ میں مجھے یہ محسوس ہوا کہ سوتے میں میرا ہاتھ گردن پر تھا۔ اور اب اس ہاتھ کی ہتھیلی بھی پھندے میں آچکی ہے۔ مجھے اپنے قریب کسی کے زور زور سے سانس چلنے کی آواز سنائی دی اور کوئی اس پھندے کے گھیرے کو تنگ کر رہا تھا۔

بس میری خوش قسمتی یہی تھی کہ سونے میں میرا ایک ہاتھ میری گردن پر رہ گیا تھا۔ اب اس ہاتھ کو جو پھندے کے اندر تھا میں نے زور لگا کر پھیلانا چاہا۔ گو پھانسی دینے والے کی گرفت بڑی مضبوط تھی۔ مگر میں دھیرے دھیرے اپنا ہاتھ گردن سے چند انچ اٹھانے میں کامیاب ہوگیا۔ پھر زور سے میں نے جو ایک جھٹکا دیا تو میری گردن پھندے کی گرفت سے آزاد ہوچکی تھی۔

کمرے میں مکمل اندھیرا تھا اور کچھ سجھائی نہ دیتا تھا۔ دوسرے لمحہ میں وہ پھڑ پھڑانے والا آدمی مجھ سے بھڑ گیا۔ ہم دونوں زور مارتے ہوئے چھپر کھٹ سے نیچے کمرے کے فرش پر آرہے۔ اور ایک دوسرے سے لڑتے بھڑتے فرش پر چکر کھاتے رہے۔

اس آدمی کا سارا بدن ننگا تھا۔ اور اس کے جسم سے بھانگ کی سی بُو آتی تھی۔ میں نے ٹٹول کر دیکھا۔ اتنا ہی محسوس کر سکا کہ وہ گٹھے ہوئے بدن کا ناٹے قد کا اور بے حد مضبوط آدمی ہے۔ اور کُشتی کے داؤ پیچ میں میرے لئے اسے ہرانا ناممکن ہی ہو گا۔

مگر میں نے کلکتہ میں جوڈو اور کراٹے کے فن بیکار نہیں سیکھے تھے۔ تین چار بار مار کھانے کے بعد میں نے اندھیرے میں اندازہ کر کے اس کی پسلیوں میں جوکراٹے کا ایک ہاتھ دیا تو وہ چکرا کر گر پڑا اور لڑھکتے ہوئے اس کے خاموش لبوں سے درد کی ایک سسکی سی نکلی۔ مگر وہ بے حد مضبوط بدن کا آدمی معلوم ہوتا تھا۔ لڑھک کر وہ پھر اٹھا اور خاموشی میں پھر مجھ سے بغلگیر ہو کر مجھے گرانے کی کوشش کرنے لگا۔ دو بڑے کرارے گھونسے مجھے لگے مگر کوشش کر کے پھر میں گرتے گرتے اس کی گرفت سے آزاد ہو گیا اور جوڈو سے ایک ایسی پٹخنی دی اور پٹخنی کھلاتے کھلاتے اس کی گردن پر اس زور کا ہاتھ دیا کہ اگر اس نے وار بچا کر میرا وار اپنے کندھے پر نہ لیا ہوتا تو اس کی گردن ہی ٹوٹ گئی ہوتی مگر شانے پر بھی میرا وار اتنا تگڑا تھا کہ وہ کئی پٹخنیاں کھاتے ہوئے فرش پر لڑھکتا گیا۔ دوسرے لمحے میں وہ آدمی ایک چھلاوے

کی طرح کھڑکی سے کود کر غائب ہو گیا۔

چند منٹ تک میں تھکے تھکے سانس لیتا رہا۔

پھر جب سانس قابو میں آیا تو میں نے دیا سلائی جلا کر کانچ کا شمعدان روشن کیا۔ اور دروازہ کھول کر باہر غلام گردش میں گیا مگر وہاں کوئی نہ تھا۔ جو کوئی بھی تھا جا چکا تھا۔

میں واپس اپنے کمرے میں گیا۔ دروازہ اچھی طرح سے بند کیا۔ دونوں کھڑکیاں جو ابھی تک کھلی تھیں بند کیں اور ایک سگریٹ سلگا کر بستر پر آ بیٹھا۔ اور کش لے لے کر اور بالوں میں انگلیاں پھرا پھرا کر سوچتا رہا کہ یہ غیر متوقع حملہ کس نے کیا اور کیوں۔ ؟

جب کچھ سمجھ میں نہیں آیا تو چادر تان کر لیٹ گیا مگر دیر تک نیند نہیں آئی پھر سوچتے سوچتے کب سو گیا کچھ معلوم نہیں۔ اٹھا تو سورج کی کرنیں کمرے میں آ رہی تھیں۔ اور کوئی زور زور سے دروازہ پیٹ رہا تھا۔

اٹھ کے دروازہ کھولا۔ داہلی بوا چائے لے کر کھڑی تھیں۔

●

○

کھانے کے کمرے میں ناشتہ لگا تھا۔ ایک پُرانی کرم خوردہ مہاگنی کی میز، جس پر شاید مہمان کے اعزاز میں آج سفید چادر بچھائی گئی تھی۔ ناشتہ کی چیزوں سے سجی ہوئی تھی۔ ویجی ٹیرین ناشتہ تھا۔ تلی ہوئی مٹر، آلو کی بھاجی مرچوں بھرا کدو کا سالن، تازہ مکھن اور گرم گرم پوریاں۔

ریکھا کی ماں بولی۔

"ٹھیک سے ناشتہ کرلو۔ آج تمہیں زمین دیکھنے جانا ہے۔ کہیں شام کو لوٹو گے۔!"

"تو کیا دن بھر کھانا نہیں ملے گا۔؟" میں نے مسکرا کر پوچھا اور غور سے سروجا دیوی کی طرف دیکھا۔ سروجا دیوی نہا کے آئی تھیں۔ اور بنارسی سلک کی سفید ساڑی پہنے تھیں۔ ان کے سرخ و سفید چہرے کا پختہ حسن عجیب دلکشی لئے ہوئے تھا۔ میں نے سوچا۔ اِس عمر میں یہ عورت

اتنی خطرناک ہے۔ تو جوانی میں اس کی ادائیں کتنی مسحور کن رہی ہوں گی۔

سروجا بولی ـــــــ "نہیں کرپارام کو دوپہر کا کھانا دیکر بھیجدونگی۔"

ریکھا نے پوچھا۔ "مگر وہ ہمیں ملے گا کہاں۔؟"

سروجا بولی۔ "وہ تمہیں شکار گھر پر مل جائے گا کھانا لے کر۔!"

"شکار گھر کہاں پر ہے۔؟" میں نے ریکھا سے پوچھا۔

"جہاں پر ہماری زمین ختم ہوتی ہے۔ اور جنگل شروع ہوتا ہے۔ وہاں پر ہے۔ تمہیں دکھا دوں گی۔!" ریکھا نے جواب دیا۔

میرے سامنے دیوار پر دو تصویریں آویزاں تھیں۔ چوڑے چکلے چہرے گُل مچھے اور تھوڑی پر سے دونوں طرف کھنچی ہوئی راجپوت وضع کی داڑھی گہری اور چمکیلی پُروقار آنکھیں اور سر پر کلغی سے سجی بانکی پگڑیاں۔ ایک کی عمر زیادہ معلوم ہوتی تھی۔ دوسرے کی کم مگر دونوں چہروں میں ایسی مشابہت تھی۔ جیسی میں نے ساوتری اور ریکھا کے چہروں میں دیکھی تھی۔

میں نے دونوں تصویروں کے بارے میں ریکھا کی ماں سے پوچھا۔

سروجا دیوی کا چہرہ دھندلا سا گیا۔ اس نے دونوں تصویروں کی طرف بس ایک لمحہ کے لئے دیکھ کر نظریں ہٹالیں۔ آہستہ سے بولی۔ "وہ جنکی عمر زیادہ ہے۔ وہ میرے پتی ہیں۔ دوسرے جو کم عمر ہیں وہ میرے دیور۔!"

"دونوں کہاں ہیں۔؟"

سروجا دیوی کچھ نہیں بولیں۔ آنکھوں میں آنسو چمکنے لگے۔

ریکھا آہستہ سے بولی۔ "دونوں کا دیہانت ہو چکا ہے۔"

سروجا دیوی بولیں ـــــــ "جب تک دونوں بھائی زندہ تھے، یہ وادی ہری بھری اور زندگی سے جیتی جاگتی تھی۔ پورے تین سو ایکڑ میں کھیتی باڑی ہوتی تھی۔ اور پچاس سے اُوپر ہمارے کارندے تھے۔ اور اس حویلی کی شان و شوکت ہی نرالی تھی۔ ان کے دیہانت کے بعد سب کچھ اُجڑ گیا۔ میں عورت ذات، کہاں تک یہ زمین سنبھال سکتی ہوں۔ لڑکی کا بیاہ ہو گیا ہے۔ صرف سات کارندے باقی ہیں۔ وہ بھی ہر دم جانے کی دھمکی دیتے ہیں۔ اس لئے میں نے سوچا ہے کہ زمین بیچ باچ کے لڑکی کے ساتھ جا رہوں۔ اگر وہاں بھی دل نہ لگا تو ہردوار چلی جاؤں گی۔ مگر اب اس ویرانے میں میرا جی نہیں لگتا۔"

"مگر میرا جی شاید لگ جائے گا۔" میں نے اس سے کہا۔

وہ بولی ـــــــ "دیکھ لو۔ جگہ پسند آجائے، تو سودا ہو جائیگا۔"

میں نے پوچھا ـــــــ "کیا مجھے ساری جگہ خریدنی ہوگی۔؟"

وہ بولی ـــــــ "نہیں، یہ گھر نہیں دوں گی۔ یہ حویلی ہمارے پُرکھوں کی آخری نشانی ہے۔ اس کے ساتھ پچاس ایکڑ زمین بھی رکھ لوں گی۔ اپنے اور ریکھا کے نام۔ کیوں۔؟ تمہیں کوئی اعتراض ہے۔؟"

"نہیں۔" میں نے کہا۔ "مجھے تو خوشی ہوگی۔ اگر آپ یہاں رہیں۔ ایک سے دو بھلے اور میں اتنی ساری زمین لے کر کرونگا بھی کیا۔ شاید اتنی رقم بھی میرے پاس نہ ہوگی۔"

سروجا دیوی کھانے کی میز سے اٹھتے ہوئے بولیں۔" ناشتہ ختم کر کے صبح

صبح نکل جاؤ تو اچھا ہے۔ حویلی کے باہر دو گھوڑے تیّار ملیں گے۔"

ریکھا کی ماں کے جانے کے بعد میں سوچ رہا تھا کہ رات کے حملے کی بات ریکھا کو بتاؤں کہ نہ بتاؤں۔ دھیرے دھیرے مٹر کے دانے ٹونگ رہا تھا کہ اتنے میں ریکھا نے پوچھا۔

"اس ویرانے میں کیوں آکر رہنا چاہتے ہو۔ کیا کسی کی محبّت میں ہارے ہوئے ہو۔؟"

میں نے ذرا توقّف کے بعد جواب دیا۔ "نہیں تو۔ ہارا اس لئے نہیں کہ کسی سے ایسی محبّت ہی نہیں کی۔ ہاں مگر کسی سے ہارنے کو جی چاہتا ہے۔"

"کیوں۔؟"

"اس لئے کہ زندگی میں پھولوں ہی سے نہیں، زخموں سے بھی کھیلا جا سکتا ہے۔ اور شاید زخموں کی حسرت زیادہ دیر پا ہوتی ہے۔ ان کا رِستا ہوا درد دھیرے دھیرے جھرنے کی طرح بہتا ہے۔"

"مگر یہاں تمہیں محبّت کرنے کے لئے کون سی عورت ملے گی۔؟ میں دو دن کے بعد اپنی سُسرال جانے والی ہوں۔ میری اماں، اگر تم زمین خرید لو گے تو وہ بھی یہ جگہ چھوڑ کر میری سُسرال آجائیں گی۔ تم اس ویرانے میں کس سے محبّت کرو گے۔؟"

"میں شاید کسی ہرنی سے محبّت کر لوں گا۔ دل میں محبّت ہو تو پتھّر بھی گداز ہو جاتے ہیں۔ اس حویلی کی ہر غلام گردش سے مجھے کسی کے پایل کی جھنکار سنائی دے گی۔ محبّت کے لئے کسی کا تصوّر بھی کافی ہے۔"

"عجیب پگلے ہو تم۔"

"پاگل نہ ہوتا تو انسانوں کی آبادی چھوڑ کر ویرانے میں کیوں آتا۔؟"

ریکھا نے ایک لمبی سانس بھری اور کھانے کی میز سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔
بولی۔ تم باہر چلو۔ میں کپڑے بدل کر آتی ہوں۔"

ریکھا جب کپڑے بدل کر حویلی سے باہر نکلی تو اس نے ہلکے اودے رنگ کی کرتی پہن رکھی تھی۔ جس پر سونے کے بٹن ٹکے ہوئے تھے۔ اور ہلکے اودے رنگ کا چوڑی دار جس میں اس کی سڈول ٹانگوں کی ترشی ہوئی پھبن عجیب بہار دے رہی تھی۔ بال لہراتی ہوئی چوٹی میں بندھے تھے۔ مگر ایک لٹ نکل کر رخسار پر آگئی تھی۔ یا لائی گئی تھی۔ حسنِ قدرت بھی ہے۔ اور صنعت بھی۔ میں نے سوچا۔ ریکھا نے گہرے اودے رنگ کا دوپٹہ اپنی گردن کے دونوں طرف ڈال لیا۔ اور بڑی مشّاقی سے گھوڑے کی پیٹھ پر بیٹھ گئی۔ میں ذرا اٹکل سے بیٹھا۔ کیونکہ میں نے تو صرف دارجلنگ کی گرمیوں کے سیزن میں گھوڑوں پر سیر کی تھی۔

ہمارے گھوڑوں کے قریب، ذرا فاصلے پر تین چار کارندے مؤدب کھڑے ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک آدمی مجھے قابلِ توجہ معلوم ہوا۔ بھاری ٹھوڑی۔ گھنی مونچھیں اور گھنے ابرو کے نیچے چھوٹی چھوٹی چمکیلی آنکھیں اور تنگ پیشانی، کس کر باندھی ہوئی پگڑی سے ڈھک گئی تھی۔ وہ بڑی چبھتی ہوئی نگاہوں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔

کچھ دور جانے کے بعد جب میں نے ریکھا سے اس آدمی کے بارے

میں پوچھا تو اس نے بتایا۔

"وہ راوت ہے۔ کارندوں کے اُوپر منیجر ہے۔ مگر طبیعت کا بڑا ہی سخت اور ظالم ہے۔"

"تو پھر تم اسے کیوں رکھے ہوئے ہو۔؟"

"سارا کام وہی دیکھتا ہے۔ میرے پتاجی کے وقت سے زمین سنبھالتا ہے۔ سخت گیر ضرور ہے۔ مگر کارندے ایسے آدمی سے ٹھیک رہتے ہیں۔ پھر شہر جا کر لگان وہی بھرتا ہے۔ اور کچہری کے کاغذ وہی دیکھتا ہے۔ وہ نہ ہو تو میری ماں کیا کرے گی بیچاری۔ خود سوچ لو۔ اس کے سہارے اس جنگل میں پڑی ہے۔ اب تم آجاؤ گے تو جیسا جی چاہے کرنا۔!"

زمین اونچی نیچی تھی۔ کہیں پر پہاڑی پگڈنڈی آجاتی۔ کہیں پر میدانی علاقہ۔ کہیں پر زمین کاشت شدہ تھی۔ مگر زیادہ تر کھیت غیر کاشت شدہ تھے۔ ان میں گھاس اُگی ہوئی تھی۔ اور بیلیں، جھاڑیاں اُگ آئی تھیں۔ یہ زمین ایک سطح مرتفع کی صورت میں تھی۔ تین سو ایکڑ کا پلاٹو جس کے تین طرف نیم دائرے کی صورت میں سر بھنی کا پہاڑی سلسلہ تھا اور بیچ میں ایک ندی بھی بہتی تھی جو پلاٹو سے نیچے گزر کر کواڑی قلعہ کی جانب چلی جاتی تھی۔ زمین کالے رنگ کی اور زرخیز تھی۔ ندی کا پانی بھی موجود تھا۔ اس لئے ایک اچھا فارم بن سکتا ہے۔ میں نے سوچا۔!

ہمارے گھوڑے اب ایک پہاڑی پگڈنڈی پر جنگل کی طرف چلے جا رہے تھے۔ آسمان پر دودھیا بادل تیر رہے تھے۔ اور میں ریکھا کی لہراتی ہوئی

جوٹی کو دیکھ رہا تھا۔ اس کی اوڑھنی کبھی چوٹی سے لڑ جاتی کبھی فضا میں اُلجھ جاتی۔ او تہہ کہہ کر ریکھا نے آخر اپنی اوڑھنی کو گھوڑے کی کاٹھی سے باندھ دیا۔ اور میں اس کی پتلی لانبی گردن کا خم دیکھنے لگا۔ وہ بڑی مشاقی سے گھوڑا دوڑا رہی تھی۔ اور مجھے اس کا ساتھ دینے میں دقت محسوس ہو رہی تھی۔ اس لئے بھی کہ میں راستہ کی طرف کم دیکھتا تھا۔ اس کی طرف زیادہ۔ عورتیں بہت جلد اپنے چہرے پر پڑی ہوئی نگاہیں محسوس کر لیتی ہیں۔ پھر ان کا چہرہ لال ہونے لگتا ہے۔ آنکھیں بھی جھک جاتی ہیں۔ اور سارے جسم میں سنسنی سی پھیلنے لگتی ہے۔ باتیں کرتے کرتے اب کافی عرصہ سے ریکھا خاموش تھی۔ یعنی جب سے میں اس کے چہرے میں ڈوب گیا تھا۔ جب سے وہ خاموش تھی۔

”آخر وہ اس لمبی خاموشی کو توڑ کر بولی۔

”کوئی بات کرو۔ ؟“

”کیا کہوں۔ ؟“

میرے چبھتے ہوئے سوال پر وہ خاموش ہو گئی۔

شکار گھر تک کا فاصلہ ہم دونوں نے خاموشی سے طے کیا۔

٭ ٭ ٭

پتھر کی دیواروں کا شکار گھر اب خستہ حالت میں تھا۔ کبھی بہت

عُمدہ حالت میں رہا ہوگا۔ بڑے بڑے مضبوط دروازے اور اونچی محراب دار کھڑکیاں، جو جنگل کی جانب کھلتی تھیں۔ قریب ہی ندی بہتی تھی۔ آئینے کی طرح شفّاف، ستھرا میٹھا پانی۔ شکار گھر کے چاروں طرف بانسوں کی پرانی باڑھ تھی۔ اور ایک باغیچہ جو اَب ڈھاک کے پیڑوں اور جنگلی بیلوں سے بھر گیا تھا۔ جگہ جگہ بیلوں پر کرمنی کے پیلے پیلے غنچے، سنہری کرن پھولوں کی طرح لٹک رہے تھے۔

دو پھول توڑ کر ریکھا نے جھمکوں کی طرح اپنے کانوں میں ٹانگ لئے۔

میں نے پوچھا۔ "ان زمینوں میں کیا پیدا ہوتا ہے۔؟"

وہ بولی۔ "جب تک پتا جی زندہ تھے تو بہت کچھ ہوتا تھا۔ ندی کے کنارے کنارے دھان کے کھیت تھے۔ پہاڑی کھیتوں میں مکّا ہوتی تھی۔ میدانی کھیتوں میں گیہوں، ریتلی زمین میں باجرا۔ جوار۔ دالیں۔ حویلی کے آس پاس کے باغیچوں میں ہر طرح کی سبزیاں اب تو ہر طرف جنگل ہی جنگل ہے۔ پھر بھی گھر بھر کے لئے سب کچھ ہو جاتا ہے۔"

میں نے کہا۔ "کوئی محنت کرے تو یہ جگہ ایک چھوٹی سی جنّت ہے۔"

وہ بولی۔ "جنّت نہیں نرک ہے۔ نرک۔!"

"نرک کیوں۔؟"

ریکھا کچھ دیر چپ رہ کر بولی۔

"آج سے پانچسال پہلے اسی شکار گھر میں کسی نے میرے پتا جی کو گولی مار دی تھی۔"

"اِسی شکار گھر میں۔؟" میں چونک گیا۔

"ہاں اِسی کمرے میں جہاں ہم بیٹھے ہیں۔ ان کی لاش پائی گئی۔!"

"قاتل کا کچھ پتہ چلا۔؟"

"نہیں، میں دوسرے کمرے میں تھی۔ گولی کی آواز سنکر......... دوڑی دوڑی آئی تو پتا جی کو خون میں لت پت فرش پر گرے ہوئے پایا۔ میں نے انہیں اٹھانے کی کوشش کی تو دیکھا ابھی وہ زندہ تھے۔ مگر آخری دموں پر تھے۔ ان کی آنکھوں میں ایک سوال تھا۔ اور وہ جیسے کچھ کہنا چاہتے ہوں۔ بہت کوشش کر کے انہوں نے کہا۔ "مجھے" اس کے بعد وہ کچھ نہ کہہ سکے۔ ان کی گردن ڈھلک گئی۔ اور آخر سانس بھی نکل گیا۔

ریکھا کی آواز بھرا گئی اور آنکھوں میں آنسو آگئے۔

ذرا توقف کے بعد میں نے پوچھا۔ "قاتل کا کچھ پتہ چلا۔"

"کچھ نہیں۔ کارندوں نے سارا جنگل چھان مارا، پولیس کئی مہینے تک تفتیش کرتی رہی مگر قاتل نہیں پکڑا گیا۔ ان کے مرنے کے ٹھیک ایک سال بعد میرے پتا جی کے چھوٹے بھائی جن کی تصویر تم حویلی میں دیکھ چکے ہو۔ ان کو بھی کسی نے اس شکار گھر کی سیڑھیوں پر گولی سے مار دیا۔"

"ارے۔!" میں حیرت سے چلایا۔

"ہاں وہ جنگل سے شکار کر کے آرہے تھے اور شکار گھر کی سیڑھیاں چڑھ رہے تھے۔ اندر آنے کے لئے گولی جنگل کی طرف سے آئی اور وہ وہیں ڈھیر ہو گئے۔

میں سکتے ہیں آگیا۔

ریکھا اپنے آنسو پونچھ کر بولی۔

"پولیس مہینوں تفتیش کرتی رہی کئی کارندے پکڑے گئے۔ مگر آخر کو سب چھوٹ گئے۔ قاتل کبھی پکڑا نہیں گیا۔!"

"پولیس کا کیا خیال تھا۔؟"

"پولیس اتنا ہی ثابت کر سکی کہ دونوں بھائی ایک ہی بندوق کی گولی سے ہلاک ہوئے تھے۔ اس لئے دونوں بھائیوں کو مارنے والا ایک ہی آدمی تھا۔ مگر وہ کون تھا۔ اس کا کچھ پتہ نہیں چلا۔ جس قسم کی بندوق سے مارے گئے یا جس قسم کی گولی سے وہ بھی حویلی کے اسلحہ خانے میں موجود تھیں۔ اِن دونوں حادثوں کے بعد اس وادی کی رونق جاتی رہی، یہ وادی اُجڑ سی گئی۔ کارندے ایک ایک کر کے بھاگ گئے۔ کوئی کہتا اس وادی پر آسیب کا سایہ ہے۔ کوئی کہتا اس وادی میں بھوت رہتے ہیں۔ اور کسی آدمی کو یہاں ٹکنے نہیں دیں گے۔ جب کسی جگہ کی شہرت ایسی نکل جائے تو پھر کون یہاں رہے گا۔ دھیرے دھیرے کر کے چار برسوں میں سب لوگ چلے گئے ہیں۔ بس ایک راوت باقی ہے۔ اور سات کارندے اور وہ بھی راوت کے آدمی ہیں اور اس نے ہی انہیں اب تک روکے رکھا ہے۔"

"اسی لئے تمہاری ماں یہ زمین بیچنا چاہتی ہیں۔؟"

"ہاں ـــــ اور تم کیا خریدو گے۔؟"

"خرید لوں گا۔ میں بھوت پریت کو نہیں مانتا۔ ہو نہ ان حادثوں میں

تمہارے کسی خاندانی دشمن کا ہاتھ ہے۔"

"اِن دونوں بھائیوں کو چھوڑ کر ہمارے خاندان کا کوئی فرد زندہ نہیں ہے۔"

"تمہارے پتاجی اور چچا کے مرنے کے بعد یہ زمین تمہیں جاتی ہے۔ یعنی تمہارے پتی کو۔!"

"میرے پتی بہت امیر ہیں۔ اپنے علاقے کے سب سے بڑے رئیس ہیں اور سب سے زیادہ زمین رکھتے ہیں۔ راجپوتی ذات میں بھی ہم سے اونچے ہیں۔"

"لالچ بُری بلا ہے۔" میں نے کہا۔

"جن دنوں میرے باپ کا قتل ہوا اس وقت تک تو میری شادی بھی نہیں ہوئی تھی۔ اس لئے کس بات کا لالچ۔؟" ریکھا نے مجھ سے پوچھا۔

یہ عمارت بھی ڈھے گئی۔ دل عجیب مخمصے میں گرفتار تھا۔ کچھ سمجھ میں ہی نہ آیا۔

"عجیب پُراسرار معاملہ ہے۔" میں نے کہا۔

ریکھا نے بات کا رُخ پلٹتے ہوئے کہا۔"اب چھوڑو ان درد بھری باتوں کو۔ اِن میں کیا رکھا ہے۔ آؤ میں تمہیں اپنے آموں کا باغ دکھاؤں۔!"

●

○

ہم پہاڑی سلسلہ سے منہ موڑ کر مغرب کی طرف چلے جدھر پلاٹو کی سطح ہموار تھی۔ بہت کم اونچی نیچی تیزی سے گھوڑے دوڑاتے ہوئے، ہم مغرب کی طرف بڑھتے گئے اور ایک پختہ دیوار کے قریب جاکر رک گئے۔

دیوار کے بیچوں بیچ بانس کا ایک دروازہ تھا۔ اُسے کھول کر اندر گئے باغ بہت بری حالت میں تھا۔ آم، جامن، لیچی کے پیڑوں کے علاوہ جھاڑ جھنکاڑ کا ایک جنگل تھا۔ جو باغ کی چار دیواری میں اگا ہوا تھا بلکہ اکثر جگہوں پر تو چوحدی کی دیواریں بھی جنگلی جھاڑیوں اور بیلوں سے پٹی پڑی تھیں۔

میں نے کہا۔ "اس باغ میں دیکھنے کے لئے رکھا کیا ہے۔"

ریکھا ایک آہ بھر کے بولی۔ "کبھی یہ باغ بہت اچھی حالت میں تھا۔ جب میرے پتاجی زندہ تھے۔ میں اس باغ میں جھولا ڈال کر جھولا کرتی تھی۔ اور باغ کے قریب ایک باؤلی تھی۔ جس کا پانی بہت ٹھنڈا اور میٹھا تھا۔!"

باغ کو جلدی جلدی پار کر کے ہم اس باؤلی کو دیکھنے گئے جو باغ کے باہر دو اونچی اونچی چٹانوں کے بیچ واقع تھی۔ مگر اب یہ باؤلی سوکھی پڑی تھی۔ اس میں ایک قطرہ پانی کا موجود نہ تھا۔

ریکھا نے افسوس بھرے لہجہ میں کہا۔

"اس باؤلی سے سارے باغ کو پانی جاتا تھا۔"

میں نے کہا۔ "اب بھی ندی کے پانی سے یہ باغ سینچا جا سکتا ہے۔ مگر تم نے باغ کی حالت کیا کر رکھی ہے۔؟"

"کون دیکھے۔؟ میں سال میں ایک مرتبہ میکے آتی ہوں۔ اماں اکیلی کیا کر سکتی ہیں۔ کہاں تک حکم چلا سکتی ہیں۔"

میں نے پوچھا۔ "تم مجھے یہ لٹا پٹا باغ دکھانے کیوں لائی ہو۔؟"

وہ بولی۔ "دراصل باغ دکھانے نہیں لائی تھی۔ آؤ ان چٹانوں پر چڑھ کر دیکھیں۔ یہاں سے اُدھر کا منظر بہت بھلا دکھائی دیتا ہے۔"

ریکھا نے انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

ہم دونوں اس اونچی چٹان پر چڑھتے گئے۔ ایک دوسرے کو سہارا دیتے ہوئے، ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑتے ہوئے۔ ایک دفعہ میں نے دونوں ہاتھ اس کی کمر میں ڈال کے اُسے گرنے سے بچا لیا۔

چٹان کے اُوپر جا کر ہم دونوں کھڑے ہو گئے اور مغرب کی طرف دیکھنے لگے یہاں آ کر یکایک سطح مرتفع کا علاقہ عمودی ڈھلانوں میں نیچے گرنے لگتا تھا۔ ڈھلوانوں کے بعد دور دور حد نگاہ تک میدانی علاقے پھیلے ہوئے تھے۔

میلوں تک رتیلے علاقے یا جنگلی علاقے۔ کہیں کہیں چھوٹے چھوٹے چھپڑوں والے گاؤں حدِ نگاہ پر شبیرا کا قصبہ دکھائی دے رہا تھا۔ جنوب میں کواڑی کا قلعہ تھا۔ جس کی نچلی چٹانوں سے ندی اُتر کر میدانوں میں چلی جاتی تھی ـــــ میں واقعی غلط راستہ سے آیا تھا۔ اگر کواڑی قلعہ سے جنوب کے بجائے مغرب سے آتا۔ سیدھے شبرا سے ایک راستہ اس پہاڑی علاقہ کو آتا تھا۔ دکھائی دیتا تھا تو جلدی پہونچ سکتا تھا۔

سورج بادلوں میں چھپ گیا تھا۔ وادی پر بادل گھر کر آنے لگے تھے۔ اور ہوا میں خنکی آچلی تھی۔

ریکھا نے ہوا کو سونگھ کر کہا۔ "چلو، جلدی واپس چلیں۔ بارش آنے ہی والی ہے۔"

ہم نے گھوڑے سرپٹ دوڑائے مگر شکار گاہ تک پہونچنے سے پہلے ہی بارش نے ہمیں آلیا۔ ایک دم طوفان اور بارش سے سارا منظر ہی بدل گیا۔ ہواؤں کے طوفانی فراٹوں سے سارا جنگل ہل رہا تھا۔ بجلی اور گرج۔ ایسا لگتا تھا جنگل میں ہاتھی چنگھاڑ رہے ہیں۔ شکار گھر تک پہونچتے پہونچتے ہم دونوں پانی سے شرابور ہو گئے۔ گھوڑوں کے صحت مند جسم پانی میں یوں چمک رہے تھے جیسے کسی نے ان کے جسم پر تیل سے مالش کی ہو۔ اور ریکھا کے سارے کپڑے اس کے جسم سے چپک گئے تھے۔ اس کی بھیگی ہوئی خوب صورتیوں کے خطوط میری آنکھوں میں دھنک کی طرح روشن ہوتے جا رہے تھے۔ میں اسے اپنی باہوں میں سمیٹ لینے کے لئے بے قرار ہوا اٹھا تھا۔ بڑی مشکل سے

یں نے اپنی نگاہیں اس کے جسم سے ہٹالیں۔ حسین لڑکیوں کو موسلا دھار بارش یں گھوڑے پر سفر نہیں کرنا چاہیئے صاحب۔ ورنہ ہم ذمّہ دار نہیں ہیں۔!

کمرے یں پہونچ کر میں نے اور ریکھا نے بڑی مشکل سے آتشدان میں آگ جلائی اور اس آگ کی حدّت سے باری باری میں نے اور ریکھا نے اپنے کپڑے سکھائے کہ اس کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا۔ جب وہ کپڑے سکھا رہی تھی۔ یں شکار گاہ کے برآمدے یں کھڑا اس کے جسم کا تصّور کرتے ہوئے سلگتا رہا۔ دُور باغ یں مور بول رہے تھے۔

ڈھاک کے چکنے پتوں سے پانی بہہ رہا تھا۔ اور تر سی ہوئی زمین سے عجیب سوندھی سوندھی خوشبو اٹھ رہی تھی۔ جیسے زمین یں سوئے ہوئے جذبے جاگ رہے ہوں۔ یں سر سے پاؤں تک گیا۔ مرد ہونا بڑا خطرناک ہوتا ہے۔ خصوصاً جب کبھی قریب یں کوئی حسین عورت اکیلی مل جائے۔ مرد ہاتھ بڑھا کر تہذیب کا سہارا لینا چاہتا ہے۔ تہذیب کی بیل ایک جھٹکے سے ٹوٹ جاتی ہے۔ یں نے دانت پیس کر آنکھیں بند کر کے اپنے آپ پر لعنت بھیجی۔ دوسرے لمحے میں جب آنکھیں کھلیں تو یں نے ریکھا کو اپنے سامنے برآمدے میں کھڑا پایا۔

کہنے لگی۔ "جاؤ اپنے کپڑے سکھا لو۔ یں یہاں کھڑی ہوں۔ جانے وہ کرپا رام اب تک کھانا لے کر کیوں نہیں آیا۔ ؟"

یں نے کہا۔ "اس موسلا دھار بارش اور طوفان میں کون یہاں تک پہونچ سکتا ہے۔ ؟"

پھر میں اس کے قریب سے گزرا۔ ریکھا نے بدن چرا لیا۔ میں اندر کمرے میں چلا گیا۔ اور دروازہ اندر سے بند کر لیا۔

کوئی ایک گھنٹے کے بعد میں نے دروازہ کھولا۔

ریکھا اندر آئی۔

اس کے پیچھے پیچھے کرپارام رسوئیا اندر آیا۔ اپنے بھیگے کپڑوں سے پانی ٹپکاتے ہوئے اندر آ کر اس نے ناشتہ دان میز پر رکھ دیا۔

میں نے ناشتہ دان کو ہاتھ لگا کے ہٹا لیا۔ حیرت زدہ ہو کر بولا۔

"ناشتہ دان ابھی تک گرم ہے۔"

ریکھا نے مسکرا کر کہا۔ "کرپارام نے رسوئی میں آگ جلا کر کھانا پھر سے گرم کیا ہے۔"

میں نے کہا۔ "اس شکار گھر میں میں نے رسوئی تو نہیں دیکھی۔!"

وہ ادھر شکار گھر سے باہر گھرے ہوئے درختوں کے بیچ میں رسوئی گھر ہے۔ اور تین اور کمرے بھی ہیں۔ نوکروں کے لئے۔ بارش تھمے تو دکھا دونگی۔"

"دیکھ کر کیا کروں گا۔؟"

"نہیں۔" ریکھا بولی۔ "جب تم یہ جگہ خریدنے والے ہو تو سب کچھ دیکھ لو۔"

میں نے کہا۔ "ابھی تو بھوک لگی ہے۔ پھر دیکھا جائیگا۔"

ریکھا نے کرپارام سے کہا جو سردی سے ٹھٹھر رہا تھا۔ "جاؤ تم رسوئی گھر میں جا کر کپڑے سکھا لو۔"

جب کرپارام جانے لگا تو ریکھا نے پوچھا۔ "چائے کا سامان لائے ہو۔؟"

"جی ہاں لایا ہوں۔"

"سہ پہر کے بعد چائے لے آنا۔"

کرپارام کے جانے کے بعد میں نے جلدی سے ناشتہ دان کھولا۔ گرم گرم پراٹھے۔ آم کا آچار۔ بُھنا ہوا مُرغ۔ آلو مٹر کباب اور پرول کی بُھجیا۔

میں نے تنک کر پوچھا۔ "یہ پرول کون کھاتا ہے۔؟"

ریکھا ہنس کر بولی۔ "میں کھاتی ہوں۔ مجھے بہت پسند ہیں۔"

"کھانا کھاؤ۔ آلو مٹر اور پرول کی بھجیا۔" میں نے مرغ کی ایک ٹانگ پراٹھے پر رکھتے ہوئے کہا۔

٭ ٭ ٭

اب ہم لوگ کھانے سے فارغ ہو کر آتشدان کے قریب آرام کرسیاں کِھسکا کے آگ تاپ رہے تھے۔ سارے بدن میں مدھم مدھم غنودگی سرایت کرتی جا رہی تھی۔ بارش اور تیز ہو گئی تھی۔ اندھیرا اور بڑھ گیا تھا۔ کھلی کھڑکی سے جنگل کی تاریکی اندر گھس آئی تھی۔ اور آتشدان کی روشنی پر غلبہ پانے کی کوشش کر رہی تھی۔

میں نے ریکھا کی طرف معنی خیز نگاہوں سے دیکھ کر کہا۔ "اب ہم کیا کرینگے۔؟"

ریکھا بڑی معصومیت سے بولی۔ "مجھے تو نیند آ رہی ہے۔ میں دوسرے کمرے میں جا کر لیٹتی ہوں۔ تم بھی چند گھڑیاں آرام کر لو۔ سہ پہر میں چائے پی کر ......" یکایک وہ رک گئی۔ ایک زور کا کھٹکا ہوا اور آتشدان پر رکھا ہوا چینی کا گلدان کھڑکی سے آنیوالی گولی کا نشانہ بنکر چکنا چور ہو گیا۔

یکایک میں نے ریکھا کو کرسی سے گھسیٹ کر اپنے ساتھ نیچے فرش پر گرا لیا۔

اتنے میں دوسری گولی چلی اور میرے شانے سے چھیلتے ہوئے گزر گئی۔

پھر چاروں طرف سنّاٹا چھا گیا۔

بارش کے باوجود ایک عجیب طرح کا خوفناک سنّاٹا اور اندھیرا۔ ہم دونوں فرش پر اوندھے لیٹے تھے اور تیز تیز سانس لے رہے تھے۔

●

○
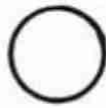
پھر ریکھا کے بدن میں حرکت سی پیدا ہوئی۔ شاید وہ اٹھنا چاہتی تھی۔ مگر میرا ہاتھ اس کی پیٹھ پر رکھا ہوا تھا۔ میں نے وہ ہاتھ ذرا سا دبا کر خاموشی سے اسے اسی طرح لیٹے رہنے کا اشارہ کر دیا۔

کڑی مصیبت میں انسانی دماغ بھی برق رفتاری سے کام ہے۔ میں نے سوچا۔ جو کوئی بھی ہے۔ جس نے گولی چلائی ہے۔ وہ اس کمرے کے اندر ضرور آئیگا۔ یہ معلوم ہے کہ ہم دونوں نہتے ہیں اور اس کے پاس بندوق ہے اس لئے اسے ہم دونوں سے خطرہ نہیں ہے۔

ہم دونوں ساتھ ساتھ لیٹے ہوئے تھے۔ میں دھیرے دھیرے ریکھا کے اور قریب سرک گیا۔ بہت ہی آہستہ سے میں نے اس کے کان کے قریب اپنے ہونٹ لے جا کر کہا۔

"جس طرح اوندھی لیٹی ہو، لیٹی رہو۔ اپنے آپ کو مردہ ظاہر کرو۔ وہ

جو کوئی بھی ہے تھوڑی دیر میں اندر ضرور آئیگا۔ مگر خبردار کوئی حرکت نہ کرنا۔ ہلنا جُلنا نہیں۔ ہم دونوں کی جان خطرے میں ہے۔!"

ریکھا نے آنکھوں کے کونے سے مجھے دیکھا۔ جیسے میری بات سمجھ چکی ہو۔ میں دھیرے دھیرے اس سے جُدا ہو کر فرش پر کھسکنے لگا۔ میں نے اپنی آنکھوں کے کونوں سے دیکھا کہ دونوں کھڑکیاں کھلی ہیں۔ دروازہ اندر سے بھڑا ہوا ہے۔ اور دروازے کے دائیں طرف ایک بڑا کپ بورڈ ہے جسکی آڑ میں چھپا جا سکتا ہے۔

میں نے اندازہ لگا کر دیکھا۔ یہ کپ بورڈ مجھ سے تین گز کے فاصلے پر تھا۔ میں بہت ہی دھیرے دھیرے بے آواز طریقے سے اس کپ بورڈ کی طرف گھسٹنے لگا۔ ایک بار ریکھا نے پلکیں اٹھا کر مجھے دیکھا۔ میں نے آنکھ کے اشارے سے اسے پھر حرکت کرنے سے منع کر دیا۔ دھیرے دھیرے انتہائی احتیاط سے میں اس کپ بورڈ کی طرف کھسکتا چلا گیا۔ لیٹے ہی لیٹے ان تین گزوں کا فاصلہ میں نے شاید تین صدیوں میں طے کیا ہوگا۔ حالانکہ میں بہت جلدی میں تھا۔ صرف اس کپ بورڈ کی آڑ میں آجانے سے ایک چانس تھا کہ ہم دونوں کی جان بچ جائے۔!

بالآخر میں کوئی آواز پیدا کئے اور زیادہ حرکت نہ کئے بغیر اس کپ بورڈ کی آڑ میں چلا گیا۔ چند ثانئے دم سادھے چپکے لیٹا رہا۔ پھر اٹھ کر بیٹھ گیا۔ تیندوے کی طرح گھات لگائے ہوئے۔ میرے ایک طرف بورڈ تھا۔ دوسری طرف آرام کرنے کے لئے ایک تخت۔ بیچ میں تھوڑی سی جگہ میں ایک کسے ہوئے اسپرنگ کی طرح میں دُبکا پڑا تھا۔ سانس تقریباً رُوکے ہوئے۔

بارش دھیمی ہو چلی تھی۔ طوفان مدھم پڑتا جا رہا تھا۔ بارش کے تواتر اور ہوا کی سائیں سائیں کے علاوہ اور کوئی آواز نہ تھی۔ ریکھا آتشدان کے پاس چپکے لیٹی ہوئی تھی۔ بالکل اوندھی، بے جان مردہ سی۔

یکایک میرے کانوں میں باہر لکڑی کے برآمدے پر لکڑی کے کسی تختے کی چر چرانے کی آواز آئی۔ آواز بالکل مدھم اور موہوم سی تھی۔ لیکن میں ہوشیار ہو کر بیٹھ گیا۔

پھر دھیرے سے دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔

اور کوئی بے آواز قدموں سے اندر آ گیا۔

اس کے اندر آنے سے پہلے بندوق کی نال اندر آئی۔ پھر دو ہاتھ اس بندوق کو پکڑے ہوئے نظر آئے پھر اس آدمی کا جسم اندر آیا۔ جھک کر چلتا ہوا۔ غور سے ریکھا کے جسم کو تکتا ہوا۔ اس کی پیٹھ میری طرف تھی۔

بس یہی ایک چانس تھا۔

میں نے اپنے جسم کی ساری طاقت مجتمع کر کے ایک جست لگائی۔ شاید آنے والے کو بھی خطرے کا احساس ہو گیا تھا۔ وہ میری طرف مڑنے ہی والا تھا کہ میرے بدن کا سارا بوجھ اپنی پوری طاقت کے ساتھ اس کے اوپر پڑا اور میرے ہاتھ کے ایک جھٹکے نے اس کی بندوق اس کے ہاتھوں سے گرا دی۔ وہ خود بھی میرے نیچے گر گیا۔ اور بندوق دور ریکھا کے قریب جا پڑی۔ میں نے چلا کر ریکھا سے کہا۔

"بندوق سنبھالو۔"

مگر ریکھا کے اعضا جیسے خوف اور خطرے سے شل ہو چکے تھے. وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی. پھر دیوار سے لگ کر خوف زدہ نگاہوں سے ہم دونوں کو تکنے لگی۔

گرے ہوئے آدمی نے اٹھنے کی کوشش کی. وہ بیحد تگڑا آدمی تھا. ناٹا اور گٹھا ہوا اور میری ہزار کوشش کے باوجود میری گرفت سے آزاد ہو کر مجھ سے بھڑ گیا۔ ہم دونوں گتھم گتھا ہو گئے اور اسی لمحے میں نے دیکھا کہ وہ راوت تھا اور اس کے جسم سے بھانگ کی بو آرہی تھی. اب مجھے پورا یقین ہو گیا کہ رات کو مجھ پر حملہ کرنے والا راوت کے سوا اور کوئی نہ تھا۔

لڑتے لڑتے اس کا ہاتھ پھر بندوق کی طرف جانے لگا. عنقریب تھا کہ وہ بندوق کو پھر سے پکڑ لینے والا تھا. کہ فوراً ریکھا نے آگے بڑھ کر بندوق اٹھا لی اور اسے ایک اضطراری حرکت کے تحت کھڑکی سے باہر پھینک دیا اور عین اسی وقت میں نے کراٹے کا ایک ہاتھ اس کے شانے پر اس زور کا دیا کہ راوت درد سے بلبلا اٹھا مگر مجھ پر جیسے بھوت سوار ہو چکا تھا اور میرے اندر جیسے سو آدمیوں کی قوت آگئی تھی. بندوق ہٹتے ہی میں اس پر پل پڑا اور لاتوں گھونسوں مکّوں کی بارش سے اسے بے حال کر دیا. پھر جوڈو کی پٹخنیاں اور کراٹے کے دوسرے زور دار ہاتھ نے اس کے دوسرے بازو کی ہڈی بھی توڑ دی۔

اب وہ بے دم ہو کر بیہوش ہو چکا تھا. اور دونوں ہاتھ پھیلائے فرش پر لیٹا تھا۔ بے سدھ بالکل بے سدھ۔

میں نے ہانپتے ہوئے ریکھا سے کہا۔

"ہوش میں آنے سے پہلے اسے باندھ دینا چاہیے. کہیں پر کوئی رسّی ملے گی.

ریکھا جیسے پھر حرکت میں آگئی۔ وہ دوڑی دوڑی دوسرے کمرے میں گئی۔ اور بستر کی چادریں اٹھالائی۔ میں نے چادریں پھاڑ کران سے راوت کو اچھی طرح باندھ کر فرش پر دھر دیا۔ پھر اسے بھاری تخت کے ایک پائے سے اچھی طرح باندھ دیا۔ جب جا کے جان میں جان آئی۔

میں تخت کے قریب کھڑا ہو کر بندھے ہوئے راوت کو دیکھ رہا تھا۔ کہ ایک دم ریکھا بھاگتی ہوئی میرے پاس آئی اور میرے سینے سے لپٹ کر خوب زور زور سے رونے لگی۔

میں آہستہ سے اُسے تسلّی دینے لگا۔" رومت ریکھا۔ اب سب ٹھیک ہے۔ اب ٹھیک ہے۔"

پھر اپنے رومال سے اپنے ہونٹوں کا بہتا ہوا خون پونچھنے لگا۔ میں قطعاً کوئی بہادر آدمی نہیں ہوں اور اب جب کہ سب کچھ ختم ہو چکا تھا۔ اور خطرہ بھی ٹل چکا تھا۔ میرا سارا جسم کانپ رہا تھا۔ میرے اندر اتنی طاقت کہاں سے آگئی۔ میں تو ایک امن پسند ڈرپوک قسم کا آدمی ہوں۔ اور لڑائی جھگڑے سے بہت دور رہتا ہوں۔ اس لئے کلکتہ سے بھاگ کر یہاں آیا تھا۔ اور کمبخت راوت نے مجھے گھونسے مکّے مار مار کر میری ہڈّی پسلی ایک کر دی تھی۔ وہ تو میری خوش قسمتی تھی کہ مجھے جوڈو اور کراٹے دونوں فن آتے ہیں۔ ورنہ میرا کیا حشر ہوتا اور ریکھا کا کیا حال ہوتا۔

ریکھا میرے سینے سے لگی دھیرے دھیرے سسک رہی تھی۔ مجھے وہ لمحہ وصال بھر المحہ سا محسوس ہوا۔ ملن کے لمحے میں بھی تو عورت اسی طرح

دھیرے دھیرے سسکتی ہے۔ مگر جلد ہی یہ میٹھا لمحہ وقت کے دھارے پر بہتے ہوئے حباب کی طرح ٹوٹ گیا۔ باہر برآمدے سے کسی کے بھاری قدموں کی چاپ سنائی دی۔ میرے بازوؤں کی گرفت ریکھا کے بدن کے گرد مضبوط ہوتی گئی۔ میں نے اسے اپنے بازوؤں چپکا لیا۔ دوسرے لمحے میں اُسے میں نے اپنے سے الگ کر کے اپنے پیچھے چھپا لیا۔

میں مقابلہ کے لئے تیار ہو گیا۔

چوکھٹ پر برتنوں کا کھٹکا سا ہوا۔ میرے جسم کا تناؤ ڈھل سا گیا۔ یہ کرپارام تھا۔ چائے لے کر اندر آیا تھا۔

میں نے ریکھا کی طرف دیکھا۔ وہ زور زور سے ہنسنے لگی۔ پھر میں بھی ہنسنے لگا۔ سارا ماحول ہی بدل گیا۔

مگر کرپارام کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ وہ راوت کو یوں بے ہوش اور بندھے ہوئے دیکھ کر کچھ چکرا سا گیا۔ پہلے تو اس کی ہمت نہ پڑی کہ وہ مجھ سے کچھ پوچھے۔ پھر جب وہ چائے میز پر رکھ چکا تو ہمیں اطمینان سے چائے پیتے دیکھ کر اور بھی چکرا گیا۔ گردن کے خم سے راوت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

"یہ ـــــ یہ ـــــ راوت ہے نا۔ ؟"

"ہاں۔ ہے تو وہی۔ !" ریکھا نے اس سے کہا۔

کرپارام نے ہچکچا کر کہا۔ "اسے کس نے باندھا ہے۔ ؟"

"ہم نے۔" ریکھا بولی۔

کرپارام وجہ پوچھنا چاہتا تھا۔مگر سوال اس کے لبوں پر آکر رک گیا۔ریکھا کا سنجیدہ اور باوقار چہرہ دیکھ کر رک گیا۔پھر اس کے چہرے پر خوشی کی ایک لہر نمودار ہوئی۔ بولا۔

" اچھّا کیا۔ ؟ سالا ہم سب پر رُعب جماتا تھا۔!"

ہم دونوں ہنسنے لگے۔

جب ہم چائے پی چکے تو کرپارام برتن اٹھا کر جانے لگا۔ میں نے اُسے ہاتھ کے اشارے سے روک کر کہا۔

" ابھی تم یہیں ٹھہرو۔ میں چند منٹ میں واپس آتا ہوں۔"

ریکھا سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھنے لگی۔

میں نے اس کی طرف دھیان نہ دیکر کرپارام سے کہا۔" دیکھو۔اگر راوت ذرا بھی ہلے جلے تو یہ کرسی اس کے سر پہ مار دینا۔ ذرا بھی تکلّف نہ کرنا۔ سمجھ گئے نا۔"

" ہاں صاحب سمجھ گیا۔" وہ کچھ نہ سمجھتے ہوئے بھی کہنے لگا۔

میں نے ریکھا سے کہا۔" میں چند منٹ میں واپس آتا ہوں۔"

بوندا باندی بہت کم ہو چکی تھی۔کمرے کی کھڑکی سے چھلانگ لگا کر باہر کود گیا۔تھوڑی دیر تک بندوق تلاش کرتا رہا۔جسے ریکھا نے کھڑکی سے باہر پھینک دیا تھا۔اچانک ایک جھاڑی کے نیچے وہ بندوق گری ہوئی مل گئی۔اسے اٹھا کر میں کمرے کے اندر لے آیا۔ اور اندر آکر میں نے کرپارام سے کہا۔

"اب تم جا سکتے ہو۔!"

کرپارام جانے لگا تو ریکھا نے اس سے کہا۔

"مگر سامان باندھ لو۔ تھوڑی دیر میں واپس چلیں گے۔ لگتا ہے گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ میں بارش تھم جائے گی۔" ریکھا بولی۔ "بارش تھمتے ہی چلیں گے۔"

کرپارام سر جھکا کر اور برتن اٹھا کے چلا گیا۔

جب کرپارام چلا گیا تو ریکھا نے راوت کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

"اس کا کیا کریں گے۔"؟

میں نے کہا ——— "ابھی بتاتا ہوں۔ ذرا اسے ہوش میں لے آؤں۔"

اتنا کہہ کر میں نے بندوق کے کندے سے راوت کو ٹھوکا دیا۔ دو تین ٹھوکوں کے بعد اس کا بدن کسمسایا۔ دھیرے دھیرے ہوش میں آتا گیا۔ پھر جب وہ مکمل ہوش میں آگیا تو کھا جانے والی نظروں سے میری طرف دیکھنے لگا۔ دو چار بار اس نے پٹیاں تڑانے کی کوشش کی مگر کامیاب نہیں ہوا۔

میں نے اس سے کہا۔ "مضبوطی سے بندھے ہو۔"

وہ چپ رہا۔ غصہ بھری نظروں سے میری طرف دیکھتا رہا۔

میں نے اس کی پسلی میں ٹھوکر مارتے ہوئے کہا۔

"کل رات کو بھی تم نے مجھ پر حملہ کیا تھا۔ کیوں۔؟"

وہ بڑی نفرت اور شدت سے بولا۔ "میں نہیں چاہتا ہماری زمین کسی اجنبی کے پاس جائے۔"

"تمہاری زمین یہ کہاں سے ہوگئی۔؟ زمین تو مالکن کی ہے۔"

وہ چپ رہا۔ میں نے دو تین بار اسے ٹھوکریں ماریں اور پوچھا۔

"بتاؤ۔ کیا ٹھاکرجی کا خون تم نے کیا تھا۔؟"

اس نے زور زور سے سر ہلا دیا مگر مجھے اس کی آنکھوں میں چھپی ہوئی وحشت سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے۔ میں نے بندوق کی نال اس کے سینے پر رکھ دی اور بڑے کڑے لہجہ میں کہا۔

"سچ سچ بتاؤ۔ نہیں تو یہ گولی تمہارے سینے کے پار ہوگی۔"

وہ میری طرف گہری نگاہوں سے دیکھتا رہا۔ جب اسے یقین ہوگیا کہ جو میں کہتا ہوں وہی کرنے کا ارادہ بھی رکھتا ہوں تو اس کی نگاہیں بدل گئیں۔ پلکیں نیچے گر گئیں۔ ایک گہری سانس لے کر بولا۔

"ہاں۔"

"کیوں۔؟"

وہ کچھ نہیں بولا۔

قدرے توقف کے بعد میں نے اس سے کہا۔ "میں تم سے کہتا ہوں کہ تم نے نہ صرف بڑے ٹھاکرجی کا خون کیا ہے بلکہ ان کے چھوٹے بھائی کا بھی۔"

"نہیں۔ نہیں۔" وہ زور سے چیخا۔

"ہاں۔ ہاں۔ تم ہی ان دونوں کے قاتل ہو۔"

"نہیں، نہیں۔" اس کی آنکھوں کی پتلیاں اب تیزی سے حرکت کر رہی تھیں۔

میں نے کیچ کھول کر بندوق کو دیکھا۔ اس میں اب کوئی گولی نہ تھی. میں نے بندوق کو الٹا کر لیا اور اس کے کندے سے راوت کو تین چار بار پیٹا۔ زور زور سے وہ بلبلا کر کہنے لگا۔ "مجھے مت مارو۔ مجھے مت مارو۔ میں ابھی سب کچھ بتا دیتا ہوں۔"

میں رُک گیا. غصّہ کے عالم میں بولا۔ "اگر نہیں بتاؤ گے تو اسی بندوق کے کندے سے تمہاری کھوپڑی توڑ ڈالوں گا۔"

راوت کی نگاہیں ریکھا کی طرف گئیں، جس کی نگاہوں میں اب خون اُبل رہا تھا. پھر لوٹ کر میری طرف آئیں. وہاں بھی اسے مایوسی ملی۔

رُکتے رُکتے لہجہ میں بولا۔ "ہاں چھوٹے ٹھاکر کا خون بھی میں نے ہی کیا تھا."

پھر اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں. کیونکہ اسے پورا یقین تھا. کہ اب اس کی کھوپڑی توڑ دی جائے گی۔ لگتا تھا. جیسے اس کے تن بدن سے جان نکل گئی۔

"مگر کیوں۔؟" میں نے اس سے پوچھا۔ "کیوں تم نے ان لوگوں کا خون کیا۔؟"

مگر وہ چپ لیٹا رہا۔ میں نے اسے بہت مارا پیٹا مگر وہ ایک لفظ بھی نہیں بولا. آخر میں صرف اتنا کہا۔ "جان سے بھی مار دو گے تو بھی نہیں بتاؤں گا۔"

مگر میں اسے مارتا ہی رہا۔ آخر ریکھا نے میرا ہاتھ روک کر کہا۔

"جانے دو۔ شپارا چوکی والے اس سے سب اگلوا لیں گے۔"
میں نے پوچھا۔ "تو اسے کیا یہیں چھوڑ دیں بندھا ہوا اور پھر کارندوں
کو بلوا کر اسے لے جائیں۔"
ریکھا بولی۔ "نہیں، ایسا کرنا ٹھیک نہ ہوگا۔ کارندے سب ہی اس
کے آدمی ہیں۔"
"تو۔؟"
"یہاں رکھنا بھی ٹھیک نہیں ہے۔ ممکن ہے اس کا کوئی ساتھی باہر
جنگل میں ہو اور ہمارے جانے کے بعد اسے آزاد کر دے۔!"
میں نے کہا۔ "یہ ممکن نہیں ہے۔ اگر اس کا کوئی ساتھی ہوتا تو اب تک
ہم پر حملہ کر چکا ہوتا۔ مگر تم ٹھیک کہتی ہو۔ اسے گھوڑے کی پیٹھ پر ہی
بندھوا کر لے چلتے ہیں۔"

٭ ٭ ٭

اَب ہمارا قافلہ واپس جا رہا تھا۔
ریکھا اپنے گھوڑے پر سوار تھی۔ اس کے بالمقابل دوسرے گھوڑے
پر راوت بندھا ہوا تھا۔ جس کی باگ میں اپنے ہاتھ میں لئے چل رہا تھا۔
دونوں گھوڑوں کے پیچھے پیچھے کرپارام باقی سامان اٹھائے چل رہا تھا۔
ریکھا کسی گہری سوچ میں مستغرق تھی۔

"کیا سوچ رہی ہو۔؟" میں نے اس سے پوچھا۔

"تم نے مجھے رات کے حملے کا کچھ نہیں بتایا۔"

"وقت ہی کہاں ملا۔ اب بتاتا ہوں۔" یہ کہہ کر میں نے اس رات کے حملہ کا سارا قصّہ بیان کر دیا۔

"مگر تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ وہ راوت ہی تھا۔؟"

"اس نے خود اقبال کیا ہے۔"

"ممکن ہے اس نے جان بچانے کی خاطر اور مار سے بچنے کے لئے ایسا کہہ دیا ہو۔"

"نہیں۔ ایک اور بھی ثبوت ہے۔"

"کیا۔؟"

"رات کو جس نے مجھ پر حملہ کیا اور جب میں اس سے گتھّم گتھا ہو گیا تو مجھے سب سے پہلے حملہ آور کے جسم سے بھانگ کی تیز تیز بو آتی تھی۔"

ریکھا نے ایک دم گھوڑا روک کر کہا۔ "مجھے اُترنے دو۔"

وہ گھوڑے سے اُتر کر دوسرے گھوڑے کے پاس گئی۔ اُچک کر اُس نے راوت کا بدن سونگھا۔ دو تین بار۔ پھر یکایک اس کا سوچ میں ڈوبا ہوا چہرہ صاف ہو گیا۔

یقین آمیز لہجہ میں بولی۔

"اب مجھے یقین آگیا ہے۔ اسی نے میرے پتا جی کا خون کیا ہے۔"

"کیسے۔؟"

"گولی لگنے کے بعد جب میں دوڑی دوڑی شکار گھر کے برآمدے میں گئی تو یکایک میرے نتھنوں میں بھانگ کی تیز تیز بو آئی تھی۔ مگر اس وقت میں نے اس کا کوئی خیال نہیں کیا۔

●

○

رات کی جھلملاتی روشنیوں میں ہم تینوں دیوان خانے میں بیٹھے تھے۔ میں، ریکھا
اور ریکھا کی ماں سرد جا دیوی۔ سارا قصّہ سنکر بھی وہ کچھ نہ بولیں۔ دو تین بار سانس
زور زور سے کھینچا۔ پھر وہی خاموشی۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے ان کی آنکھوں
کا پُراسرار درد اور بڑھ گیا ہے۔ رات کی تاریکی اور گہری ہوگئی ہے۔ اور چہرے
کا حسن اور چمک اٹھا ہے۔ سیاہ ساڑی کے پلّو میں وہ چاند سا چہرہ
...... ریکھا کے بالکل قریب بیٹھے ہوئے وہ ریکھا کی ماں نہیں ریکھا کی بڑی
بہن معلوم ہو رہی تھیں۔

پھر خاموشی توڑتے ہوئے وہ بولیں "ریکھا تم جاؤ۔ اپنے کمرے میں
آرام کرو۔ میں ان سے اکیلے میں باتیں کرنا چاہتی ہوں۔"

ریکھا کچھ کہے بغیر کمرے سے باہر چلی گئی۔

ریکھا کے جانے کے بعد بھی وہ کچھ نہ بولیں۔ صرف اپنی سیاہ ساڑی

کے پلو کو انگلیوں میں لے کر مسلتی رہیں۔
آخر میں نے کہا ــــــ "مجھے ایسا لگتا ہے کہ اس راز کی کنجی آپ کے پاس ہے"
"کس راز کی۔ ؟" وہ آہستہ سے بولیں۔
" اب تک جو کچھ ہوا۔ گذشتہ چھ سات برس میں۔ بڑے ٹھاکر جی کا قتل، چھوٹے ٹھاکر کا قتل۔ راوت کا مجھ پر گولی چلانا۔ مجھے یہ سب ایک ہی سلسلہ کی کڑیاں معلوم ہوتی ہیں۔ اور کنجی آپ کے پاس ہے۔ !"
پھر جیسے انہوں نے کچھ فیصلہ کر لیا۔ پلّو چھوڑ کر مضبوطی سے بیٹھ گیئں۔ اور پُر اعتماد لہجہ میں بولیں۔
" تم نے میری بچّی کی جان بچائی ہے۔ اس لئے تمہیں سب کچھ جاننے کا حق ہے۔ پوچھو۔ کیا پوچھتے ہو۔ ؟ میں سب بتا دوں گی۔ یعنی جو کچھ مجھے معلوم ہے وہ سب بتا دوں گی۔ آج رات .... ممکن ہے آج کے بعد ایسی رات پھر کبھی نہ آئے۔"
میں نے ان کا آخری فقرہ نہیں سمجھا۔ اس پر زیادہ دھیان بھی نہیں دیا۔ دوسری بہت سی گتھیاں ایسی تھیں جنہیں میرے لئے اس وقت سلجھانا ضروری تھا۔ اس لئے میں نے شروع کیا۔
"کیا آپ کو معلوم تھا کہ بڑے ٹھاکر جی کا قتل کس نے کیا۔
وہ بڑی شدّت سے بولیں۔
" اگر مجھے معلوم ہوتا تو میں اس راوت کے بچے کو زندہ چھوڑتی۔ ؟"
"تو آپ کو راوت پر کب شبہ ہوا۔ ؟"

"آج سے پہلے کبھی شُبہ نہیں ہوا۔ تم سے پہلی بار معلوم ہوا۔"

میں غور سے ان کی آنکھوں کی طرف دیکھنے لگا۔

"سچ کہتی ہیں آپ۔؟"

"ہاں۔!"

اتنا تو کہا انہوں نے مگر مجھے ایسا لگا جیسے اس "ہاں" کے پس پر دہ کوئی اور گھنڈی ہے۔ جسے وہ اس وقت بتانے سے ہچکچا رہی ہیں۔

"اور جب چھوٹے ٹھاکر کا قتل ہوا اسی شکار گھر میں اس وقت بھی آپ کو کسی پر شبہ نہیں ہوا۔؟"

"اس وقت شبہ نہیں یقین تھا۔"

"کس پر۔؟"

"راوت پر۔"

"آپ کو معلوم تھا کہ راوت نے ہی چھوٹے ٹھاکر کا خون کیا ہے۔؟"

"ہاں۔"

"اور یہ معلوم ہوتے ہوئے بھی۔ آپ نے پولیس کو کچھ نہیں بتایا۔؟"

"نہیں۔"

"کیوں۔؟"

"کیونکہ راوت کو میں نے ہی مجبور کیا تھا کہ وہ چھوٹے ٹھاکر کو گولی مار دے۔"

میں چکرا گیا۔ کئی ثانئے سناٹے میں رہا۔ رات کا سانس گھٹ سا رہا تھا۔

اور شمع دانوں کی لویں مدھم سی پڑنے لگی تھیں۔ میں ان کے چہرے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ چہرہ جو ہر طرح کے جذبات سے عاری تھا۔ خاموش اور بالکل پُرسکون چہرہ۔

"ایسا کیوں کیا آپ نے۔؟"

"کیونکہ اس وقت تک میں یہ سمجھتی تھی۔ کہ چھوٹے ٹھاکر نے یعنی میرے دیور نے میرے پتی کا خون کیا ہے۔"

"اگر آپ کو چھوٹے ٹھاکر پر شبہ تھا۔ تو پولیس سے کہا ہوتا۔"

"کیا کہتی میرے پاس کیا ثبوت تھا۔"

"آپ نے اس وقت چھوٹے ٹھاکر کو بڑے ٹھاکر کا قاتل کیوں جانا۔ کیا جائیداد کی وجہ سے۔؟"

"نہیں، جائیداد کے وہ دونوں برابر کے حصّے دار تھے۔ بڑے ٹھاکر جی کے مرنے کے بعد میرے حصّے میں آتی اور ریکھا کے حصّہ میں۔ چھوٹے ٹھاکر جی پر میں نے اس وجہ سے شبہ نہیں کیا۔

"پھر کس وجہ سے۔؟"

وہ چپ رہیں۔ پھر ساڑی کا پلّو لے کر مسلنا شروع کر دیا۔ آخر ہار گئیں۔ تھکے ہوئے لہجہ میں نیم سرگوشی میں بولیں۔

"وہ مجھ سے پیار کرتے تھے۔ چھوٹے ٹھاکر......"

میں چونک گیا۔ پھر کچھ دیر کے بعد بولا۔ "اور آپ بھی۔؟"

"نہیں، میں نہیں۔ صرف وہ......جب تک بڑے ٹھاکر جی زندہ

رہے۔ میں انہیں سمجھاتی رہی۔ مگر وہ نہیں مانے، مانتے ہی نہیں تھے۔ پھر بھی میں انہیں سمجھاتی رہی اور ٹھاکر جی سے کچھ نہیں کہا۔ اگر کہتی تو اپنے دیور کی جان جاتی۔ اس خوف سے چپ رہی۔ اور اس وجہ سے بھی کہ نادان ہے، دھیرے دھیرے سمجھ جائے گا۔"

میں نے پوچھا۔ اگر چھوٹے ٹھاکر آپ سے پیار کرتے تھے تو آپ ان سے دُور رہتیں۔ انہیں جان سے کیوں مروا دیا۔؟"

"کہہ چکی ہوں، مجھے شبہ تھا کہ میرے دیور نے میری محبّت میں پاگل ہو کر میرے پتی کو جان سے مار دیا ہے۔ مگر اس بات کا بھی مجھے بس شبہ تھا۔ لیکن یہ شبہ یقین میں بدل گیا۔ جب..... جب.....!"

وہ یکایک چپ ہو گئیں۔

"جب کیا۔؟"

"جب میرے دیور نے میرے پتی کے مرنے کے بعد، کوئی ان کی موت کے چھ سات مہینے کے بعد مجھ پر ہاتھ اٹھایا۔

"ہاتھ اٹھایا ـــــ یعنی مارا۔؟"

"نہیں میری آبرو ریزی کی۔ ایک رات۔ ایک طوفانی رات کو میرے کمرے میں گھس کر میری عزّت لوٹ لی۔ میں چیختی چلّاتی رہ گئی۔ مگر طوفان کی گرج میں کسی کو کچھ پتہ نہ چلا۔ کوئی میری مدد کو نہ آیا۔ اور میں لُٹ گئی۔"

ضبط کرنے کے باوجود ان کی آنکھوں سے دو آنسو نکل پڑے۔ ایک گہری سانس لے کر بولیں۔

"اس رات میں نے فیصلہ کیا کہ چھوٹے ٹھاکر کو قتل کر دیا جائیگا۔ یا اگر وہ زندہ رہے گا تو میں اپنی جان دیدوں گی۔ مگر میرے سامنے میری بچی رکھیا تھی۔ میں اس کے لئے زندہ رہنا چاہتی تھی۔ اس لئے۔ اس لئے......"

وہ چپ ہوگئیں۔

"اس لئے چھوٹے ٹھاکر جان سے گئے۔" میں نے آہستہ سے کہا اور پھر پوچھا۔ کیا اب آپ اس قتل پر پشیمان ہیں۔؟"

"نہیں۔ بالکل نہیں۔" وہ بڑی شدّت سے بولیں۔

"میں یہی کرتی جو میں نے کیا۔ اب بھی ——— آج بھی یہی کچھ ہوتا جو اُس دن ہوا۔"

میں اپنی جگہ سے اٹھ کر دیوان خانے میں ٹہلنے لگا۔ گتّھی سلجھ رہی تھی۔ دھیرے دھیرے روشنی آرہی تھی۔ میں نے مڑ کر پوچھا۔

"چھوٹے ٹھاکر کی موت کے بعد کیا ہوا۔؟"

"دھیرے دھیرے کارندوں نے کھسکنا شروع کیا۔ جب پولیس قتل کا سراغ نہیں لگا سکی۔ دونوں قتل پُراسرار رہے تو کارندوں میں کسی نے خبر پھیلا دی کہ اس وادی پر آسیب کا سایہ ہے۔ کسی بھوت نے دونوں ٹھاکروں کی جان لے لی ہے۔ دھیرے دھیرے کارندے کام چھوڑ کر بھاگنے لگے۔ آخر میں یہی سات آٹھ کارندے رہ گئے۔ جو رادت کی تحویل میں ہیں۔ تین چوتھائی کے قریب زمین غیر آباد ہوگئی۔ تم خود آج اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے ہو۔ اور یہ سات آٹھ کارندے ہیں جو باقی رہ گئے ہیں۔ وہ بھی

راوت کی وجہ سے، راوت شروع سے آجتک بڑی دلجمعی سے کام کرتا رہا ہے۔
وہ ہمارا سب سے پُرانا ملازم ہے۔

"آپ کو اس پر بہت بھروسہ ہے۔؟"

"تھا۔ میں ہی نہیں، بڑے ٹھاکر جی بھی اس پر مکمّل بھروسہ کرتے تھے
اس لئے آج سے پہلے کسی کو اس پر شک نہ ہو سکا۔"

"آپ کے ساتھ اس کا سلوک کیسا رہا۔؟"

یہ کہہ کر میں سروجا دیوی کے بالکل قریب آگیا اور سیدھا اس کی آنکھوں
میں دیکھنے لگا۔

وہ پھر اپنے پلّو کی رسّی بٹنے لگیں۔

میں نے کہا ——— "سچ سچ بولنا ہوگا۔ آج امتحان کا وقت ہے۔ دیواروں
پر سامنے لگی ٹھاکروں کی تصویریں تم سے زندگی اور موت کا حساب مانگتی
ہیں ———!"

وہ بولیں ——— "دیور جی کی موت کے بعد کوئی آٹھ دس ماہ تک
تو بڑے سکون سے کٹے۔ پھر جب کارندوں نے بھاگنا شروع کیا تو دھیرے
دھیرے راوت نے پَر پُرزے نکالنے شروع کئے۔ دھیرے دھیرے زمینوں
کا سارا اختیار اس کے ہاتھ میں چلا گیا۔ میں اکیلی تھی اور سب دوسرے تمام
کارندے اس کے اپنے تھے اور میری لڑکی بیاہی جا چکی تھی۔ اب بھی وہ میری
عزّت کرتا تھا۔ مگر بس خالی خولی عزّت ہی ورنہ وہ کرتا وہی تھا جو اس کا جی
چاہتا۔ جب چاہتا میرا حکم ٹال جاتا۔ اپنی من مانی کرنے لگتا۔ دھیرے دھیرے

وہ یہ ظاہر کرنے لگا جیسے اصل میں زمینوں کے متعلق فیصلہ کرنے والا وہی ہے۔ میں تو خالی نام کی ہی مالک ہوں۔ اس لئے جب اس نے یہ سُنا ہوگا کہ تم یہ زمین خریدنے والے ہو تو اس نے تمہیں راستہ سے ہٹانے کی کوشش کی۔"

"صرف مجھے ہی نہیں، ریکھا پر بھی اس نے گولی چلائی۔ کیوں۔؟"

"میں نہیں جانتی۔"

"آپ جانتی ہیں۔"

"میں نہیں جانتی۔"

"سنو۔!" میں نے ان سے کہا۔

"یہ قصّہ آج سے نہیں شروع ہوا ہے۔ آج سے بہت پہلے سے شروع ہوتا ہے۔ میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ بڑے ٹھاکر جی کو اس نے کیوں قتل کیا۔ کیا ایسا تو نہیں ہے کہ اس کا پلان شروع ہی سے بڑے ٹھاکر اور چھوٹے ٹھاکر کو قتل کر دینے کا تھا تاکہ زمینوں پر اس کا اختیار مکمّل ہو جائے۔"

"مگر یہ زمینیں اس کی کیسے ہو سکتی تھیں۔ بڑے ٹھاکر کے بعد چھوٹے ٹھاکر اور میں ان کے وارث ہوتے ہیں۔ میرے بعد میری بیٹی ان کی وارث ہوگی میری بیٹی کے بعد میری بیٹی کا شوہر ان کا وارث ہوتا۔ اس کے بعد میری بیٹی کا نہنا۔ کیا وہ یہ سب نہیں جانتا تھا۔؟" وہ چیخ کر بولیں۔

"معاملہ اس سے بھی ٹیڑھا ہے۔" میں نے ان سے کہا۔

"وہ یہ سب کچھ جانتا تھا، پھر بھی اس نے یہ سب کچھ کیوں کیا۔؟ اس

لئے نہیں کہ وہ اِن زمینوں کا قانونی مالک بننا چاہتا تھا۔ مالک چاہے کوئی بھی رہے اور یہ بڑے ٹھاکر جی کی موجودگی میں نہیں ہو سکتا تھا۔ اس لئے اس نے بڑے ٹھاکر جی کو قتل کر دیا۔ پھر جب آپ نے چھوٹے ٹھاکر جی کے قتل کا معاملہ اس کے سامنے رکھا تو چونکہ یہ قتل اس کا راستہ صاف کرتا ہے اس لئے انہیں بھی قتل کر دیا۔ لڑکی کی شادی ہو گئی۔ آپ نہتّی بے یار و مددگار رہ گئیں......... وہ جو چاہتا تھا وہ پورا ہو گیا۔ یعنی اگر میں نہ آجاتا.....

......کیوں۔ ؟"

وہ بولی۔ "اب تو یہی ٹھیک معلوم ہوتا ہے۔ جو تم کہتے ہو۔"

"نہیں، یہ بھی ٹھیک نہیں ہے۔" میں نے سروجا دیوی کو ڈپٹ کر کہا۔ "میرا اندازہ کچھ اور ہے۔"

"تمہارا اندازہ کیا ہے۔ ؟" انہوں نے مجھ سے بڑی کمزور آواز میں معلوم کیا۔

"میرا خیال ہے وہ تم سے محبّت کرتا ہے۔"

وہ کچھ نہیں بولیں۔ پہلے پلّو ملتی رہیں۔ پھر دھیرے دھیرے سسکنے لگیں۔ پھر وہ دیوان پر گر گئیں۔ انہوں نے دونوں ہاتھوں سے اپنا منھ چھپا لیا۔ اور اُن کا سارا بدن سسکیوں سے ہِل رہا تھا۔

میں نے ان سے کچھ نہیں کہا۔ میں دیر تک دیوان خانے میں ٹہلتا رہا۔ پھر باہر نکل کر صحن میں ٹہلتا رہا۔ میرا اندازہ غلط نہیں نکلا۔ سروجا دیوی نے کچھ کہا نہیں تھا۔ لیکن ان کی سسکیاں ان کے دل کی غماز تھیں۔

کوئی آدھے گھنٹے تک ٹہلنے کے بعد جب میں نے سوچا ان کے آنسو سوکھ گئے ہوں گے تو میں دیوان خانے کے اندر گیا۔ وہ ایک دیوان پر خاموش بیٹھی تھیں ۔ انہوں نے اپنے آنسو پونچھ لئے تھے اور اپنے آپ پر قابو پا لیا تھا۔

جب میں اندر آیا تو وہ میری طرف شرمسار نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بولیں ۔

"تمہارا اندازہ بالکل صحیح ہے. لیکن میں تمہیں بتانا چاہتی ہوں کہ میں نے آج تک اُسے اپنے بدن کو چھونے نہیں دیا۔ وہ بڑا ہوشیار اور چالاک نکلا. جب تک ریکھا کی شادی نہیں ہوگئی. اس نے مجھ سے کچھ نہیں کہا. لیکن لڑکی کی شادی کے بعد دھیرے دھیرے اس نے اپنے دل کے جذبات کو مجھ پر ظاہر کرنا شروع کیا. میں نے چاہا. میں پہلے دن ہی اسے نکال دوں لیکن اگر اسے نکال دیتی تو یہ زمین کون دیکھتا. سارے کارندوں پر اس کا حکم چلتا تھا. اور وہ اسی کی بات مانتے تھے. میں اگر اسے نکال دیتی تو میں اس جنگل میں اکیلی رہ جاتی اس لئے میں اسے طرح دیتی رہی. اور وہ برداشت کرتا گیا. جو کوئی زمین خریدنے آتا وہ کسی نہ کسی طرح اسے چلتا کر دیتا تھا. یہ میں آج جان گئی ہوں لیکن اس سے پہلے نہیں ۔ ہاں اب میں اندازہ کرسکتی ہوں کہ وہ مجھے کتنا چاہتا ہے. اس نے میری خاطر ٹھاکر جی کا خون کیا. پھر چھوٹے ٹھاکر کا. اس کے لئے اگر میں نہ کہتی جب بھی وہ اسے مار ڈالتا ۔ وہ صرف یہ چاہتا تھا کہ یہاں میں رہوں اور وہ رہے ۔ اوپر سے میں مالک رہوں گی ۔ اندر سے وہ ہم دونوں کا مالک رہیگا. زمینوں کا بھی اور میرا بھی۔"

"کیا یہ آپ کے لئے ناقابلِ قبول ہوتا۔ ؟"

"شروع میں تو میں اس سے انتہائی نفرت کرتی تھی۔ میں اس پر لعن طعن کرتی۔ اسے گالیاں دیتی، اسے شرم دلاتی، مگر اس پر کسی بات کا اثر نہ ہوتا تھا۔ وہ بہت مضبوط ارادے کا مالک ہے۔ اس نے مجھے آجتک کبھی ہاتھ نہیں لگایا حالانکہ وہ لگا سکتا تھا۔ مگر وہ اس لمحے کے انتظار میں تھا جب وہ لمحہ ایک پکّے ہوئے پھل کی طرح اس کی جھولی میں گر جائے۔ اس نے انتظار کیا اور انتظار کرتا رہا اور دھیرے دھیرے میں اس کی قوت، ہمّت اور برداشت کی حس کی قائل ہو گئی۔ اگر تم نہ آتے۔ اگر مجھے اپنے ٹھاکر جی کے قاتل کا پتہ نہ چلتا تو یہ ہو سکتا تھا کہ میں ایک دن اس کی گود میں گر جاتی۔ میں تم سے جھوٹ نہیں بولوں گی۔ دل کی کوئی بات آج تم سے چھپا کر نہ رکھوں گی۔ یہ سچ ہے پچھلے چند ماہ سے مجھے اس پر ترس آنے لگا تھا۔

"اور اب۔ ؟ اب کیا کرنا ہوگا۔ ؟ سروجا جی ...... پولیس میں تو ہم جا نہیں سکتے۔ !"

وہ آہستہ سے بولیں۔ "اب یہ معاملہ پولیس کے ہاتھ میں نہیں جائیگا۔ اب یہ معاملہ صرف میرے اور اس کے درمیان ہے۔"

"اور تم کیا کرو گی۔ ؟"

یکایک اس نے اپنی کمر میں اُڑسا ہوا خنجر نکال لیا۔ اور بولی۔ "اب اس خنجر سے میں اس کا خاتمہ کر دوں گی۔ اس نے میرا سہاگ لیا ہے۔ میں اس کی جان لے لوں گی۔ مگر تمہیں اس سے پہلے میری بیٹی کو یہاں سے

لیجانا ہوگا۔ وہ یوں بھی دو دن کے بعد اپنی سُسرال جارہی تھی۔ مگر اَب میں اسے کسی کارندے کو نہیں سونپ سکتی۔ تم اسے شپارا تک حفاظت سے لیجاؤ گے۔ آگے وہ خود ہی چلی جائے گی۔ کل صبح ہی تم دونوں یہاں سے چلے جاؤ۔ میں نہیں چاہتی کہ میری بیٹی پر یا تم پر کسی طرح کی آنچ آئے۔ کوئی بھی پوچھنا چھ ہو۔ جب میری بیٹی اپنی سُسرال پہونچ جائے گی تو میں اس موذی کو ہلاک کر دوں گی۔ !"

"سوچ لیجئے ــــــ پولیس۔"

"اس کو پولیس میں دینے سے پہلے مجھے خود کو پولیس کے حوالے کرنا پڑیگا۔ وہ میں کرسکتی ہوں۔ مجھے اب اپنی جان کی بھی پروا نہیں ہے۔ لیکن اس سے ٹھاکر صاحب کے خاندان کی جو ہیٹی ہوگی۔ میری بیٹی کی جو بے عزّتی ہوگی۔ اس کے بعد اس کا شوہر اسے اپنے گھر میں بھی نہیں رکھے گا۔ نہیں، نہیں۔ یہ معاملہ پولیس کا نہیں ہے۔ یہ معاملہ اب صرف میرے اور اس کے درمیان ہے۔ مگر تم میری بیٹی کو یہاں سے فوراً لے جاؤ۔ کل ہی لے جاؤ۔ میں تمہیں قسم دیتی ہوں۔ ورنہ نہ جانے میں کیا کر بیٹھوں۔ ؟"

"نہیں، نہیں۔ قسم کھلانے کی ضرورت نہیں ہے۔" میں نے اس سے بڑی نرمی اور بڑے رنج سے کہا۔ کیونکہ اب اس کی دلیل میری سمجھ میں آرہی تھی۔

"میں تمہاری بیٹی کو کل ہی یہاں سے لے جاؤں گا اور اگر وہ چاہے گی تو اس کے سُسرال تک چھوڑ کے آؤں گا۔ مگر پھر ان زمینوں کا کیا ہوگا۔ میں تو انہیں خریدنے آیا تھا۔"

"نہیں، میں یہ زمین اَب تمہیں نہیں دوں گی۔ اِن زمینوں پراب میرا کوئی حق نہیں ہے۔ شاید اب کسی کا بھی اِن زمینوں پر حق نہیں ہے۔ اور تم اَب لہو اور نحوست میں نہائی ہوئی اس زمین کو لے کر کیا کرو گے۔ یہاں کوئی رہ کر خوش نہ رہ سکے گا، جس سکون کی تلاش میں تم یہاں آئے تھے۔ وہ تمہیں یہاں کبھی نہ مل سکے گا۔ اب یہ زمین ہمیشہ کے لئے بنجر اور بے مالک ہی رہ جائے تو اچھا ہے۔"

اس کی اس دلیل میں بھی وزن تھا۔ میں سر جھکائے اس کے دیوان خانے سے باہر نکل گیا

●

○
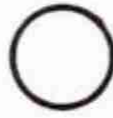
دوسرے دن پو پھٹنے سے پہلے ہی تیسرے پہر کی نیم تاریکی میں ہم دونوں اس گھر سے رُخصت ہو گئے۔ سرجا دیوی نہیں چاہتی تھیں کہ کسی کو ہمارے چلے جانے کا پتہ چلے۔ اس لئے اس نے ہمیں گھوڑے لے جانے سے بھی منع کیا کیونکہ اگر گھوڑ جاتے تو ساتھ میں دو کارندے بھی جاتے اور کارندوں کو خبر ہونے سے ہمارا خطرہ بڑھ سکتا تھا۔ ویسے رات ہی سے راوت کے متعلق بہت سی چہ میگوئیاں شروع ہو گئی تھیں۔ مگر مالکن نے یہ مشہور کر دیا تھا کہ کسی چٹان سے نیچے گر جانے سے راوت سخت زخمی ہوا ہے اور مالکن خود اس کی تیمار داری کر رہی ہیں۔ اس لئے کسی کارندے کو اسے دیکھنے کی اجازت نہیں ہے۔ اس بات سے کارندے پوری طرح سے مطمئن تو نہ ہوئے تھے۔ ہاں خاموش ضرور ہو گئے تھے۔

چلتے وقت داہلی بوا نے ایک ناشتہ دان میرے ہاتھ میں تھما دیا۔

دہلیز پر رک کر ریکھا نے کہا۔

"اماں اب تم کو زیادہ دن یہاں نہیں رہنا چاہیئے۔ جلد سے جلد یہ زمین بیچ کر میرے پاس آجاؤ۔"

"ایسا ہی کروں گی۔" ماں نے جواب دیا۔

"تو تم ان کو زمین کیوں نہیں دے دیتیں۔؟" ریکھا نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

"میں نے ان سے کہہ دیا ہے۔ تم کو پہونچا کر سات آٹھ دن کے بعد آئیں جب تک میں اچھی طرح سوچ لوں گی۔"

"اب سوچنے کا وقت نکل چکا ہے ماں۔" ریکھا نے اپنی ماں کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔

ریکھا کی ماں کی پلکوں پر بھی آنسو لرزنے لگے۔ دونوں ماں بیٹی ایک دوسرے سے گلے لگ کے سسکیوں کے درمیان یوں رخصت ہوئیں جیسے یہ ان کی آخری ملاقات ہو۔

٭ ٭ ٭

وہ صبح بادلوں سے گھری ہوئی تھی۔ وادی سے جانیوالی موہوم سی رہ گزر روائے شب میں لپٹی ہوئی ابھی تک سو رہی تھی۔ ہمارے بے آواز قدموں کے نیچے کبھی کبھی سوکھی شاخ کے زرد پتے چرمرا جاتے۔ کبھی بیری کی جھاڑیوں میں کوئی چڑیا پھڑ پھڑا کر پھر اپنی چونچ پروں میں دبا کر خواب ناک

غنودگی میں کھو جاتی۔ ہمارے قدم وادی کی بلندی سے اُترائی کی طرف بڑھتے گئے۔ جگہ جگہ شبنم میں بھیگے ہوئے پڑرات کے نشے میں مسحور خاموش کھڑے نظر آتے تھے۔ ریکھا آگے آگے چل رہی تھی۔ میں اس کے پیچھے پیچھے۔ راستہ میں کئی جگہ عمودی چٹانوں کی اترائی تھی۔ جن سے اُترنا محال ہی نہیں بلکہ خطرناک بھی تھا مگر ریکھا مجھے سہارا دیتی ہوئی، کبھی میرا ہاتھ پکڑے ہوئے کسی ہوشیار بکری کی طرح ان چٹانوں کو پھلانگتی گزر جاتی۔

میں نے کہا ــــــ "مجھے نہیں معلوم تھا۔ تمہاری ایسی نازک بدن اس مشکل راستہ پر پیدل چل سکے گی۔"

"واہ کیوں نہیں۔" ریکھا چمک کر بولی۔ "یہ سارے راستے میرے جانے پہچانے ہیں۔ شادی سے پہلے میں ایک آوارہ بکری کی طرح ان راستوں پر اکیلی گھوما کرتی تھی۔"

میں نے پوچھا ــــــ "یہ راستہ کافی مشکل معلوم ہوتا ہے۔ ہم نے کواڑی قلعہ والا راستہ کیوں نہیں اختیار کیا۔ وہ آسان تھا۔"

"آسان شاید ہوگا مگر لمبا بہت ہے۔ جس راستہ پر میں تمہیں لے جا رہی ہوں اس راستہ پر چلتے ہوئے ہم دوپہر تک شپارا قصبہ کے آس پاس پہونچ جائیں گے۔" ریکھا نے مجھے بتایا۔

٭ ٭ ٭

رات ایک آخری سانس لیکر وادی سے بلند ہوگئی اور تاریک بادلوں سے گھرے ہوئے آسمان کے پسِ پشت اجالے کے شفاف لہریئے نمودار ہونے لگے۔ اور پرندوں کے غول کے غول نیچے میدانوں میں جگہ جگہ درختوں سے گھرے ہوئے کنجوں اور اونچے اونچے ٹیلوں پر آباد جھپڑوں سے دھواں اٹھ رہا ہے۔ صبح بدن کسمساتے ہوئے اُٹھ رہی ہے اور کجلائی آنکھوں کو ملتی ہوئی رات کی مدماتیوں کو جاگنے کی دعوت دے رہی ہے۔ رات سے صبح ہونے تک اور شفق سے شام کے ڈھلنے تک کے عمل میں اتنی جنسی کشش کیوں ہے۔ شاید اس لئے کہ دو وقت ملتے ہیں اور گلے لگ کر ایک دوسرے سے پیار کرتے ہیں۔ مگر ریکھا تو مجھ سے آگے بھاگی جا رہی ہے۔ شاید اسے وقت کے وصال کا اندازہ نہیں ہے یا اس کے ذہن میں کسی کے بھاگتے ہوئے قدم ابھر آئیں اور میں انہیں اپنے دل میں چھپا لوں اور اس کے دل میں کسی دوسرے کی تصویریں ابھریں اور اسے محسوس بھی نہ ہو کہ میں نے اپنے دل میں کیا چھپا لیا ہے / جب تک تصویریں نہیں ملتیں احساس نہیں ملتے۔ ارمان نہیں ملتے، محبت بھی نہیں ملتی۔ صرف دو بدن مل جانے سے کچھ نہیں ہوتا ہے۔

چلتے چلتے ریکھا نے رک کر اور مڑ کر پورب کی طرف دیکھا۔ جدھر سر بھنی کی پہاڑیوں کے سلسلہ گہرے بادلوں میں چھپ گئے تھے۔ اور ان میں کبھی کبھی بجلی کوند جاتی تھی۔ گو صبح ہوگئی تھی۔ لیکن ابھی سورج نہیں نکلا تھا۔ شاید پہاڑیوں کے پیچھے نکل آیا ہو مگر بادلوں کا نقاب اوڑھے ہوئے۔

ریکھا نے ہوا کو سونگھ کر کہا۔ "سر بھنی کی پہاڑیوں میں بارش ہو رہی ہے۔"

میں نے کہا۔
"مجھے صبح کی یہ خنکی اچھی معلوم ہوتی ہے۔ سفر اچھی طرح کٹ جائے گا۔"
یکایک ریکھا کھڑی کھڑی کانپی۔
میں نے پوچھا۔ "کیوں۔؟"
وہ افسردہ لہجہ میں بولی۔ —— "جانے کیا بات ہے۔ ماں سے بچھڑنے کا ملال ابھی تک دل میں ڈنک مار رہا ہے۔"
میں نے کہا —— "گھبراؤ نہیں۔ وہ اپنی حفاظت کرنا خود جانتی ہیں —!"
"یہ تو مجھے معلوم ہے۔" ریکھا نے کسی قدر مطمئن ہو کر قدم آگے بڑھائے۔
اب راستہ زیادہ مشکل ہو گیا تھا۔ اونچی نیچی چٹانوں سے گزرنا پڑتا تھا۔ جن میں کہیں کہیں جنگلی درختوں کے کنج کھڑے تھے۔ کہیں پر چھوٹی چھوٹی غاریں تھیں۔

ریکھا نے مجھے بتایا۔ "بس یہ راستہ کٹ جائے۔ پھر آدھے میل کی آخری ڈھلان ہے۔ اس کے بعد دھولیا ندی، دوسری طرف دھولیا گاؤں اور پھر میدانی علاقہ۔ ندی پار کرنے کے بعد شپارا تک پہونچ جانے میں صرف تین گھنٹے لگیں گے۔"

میں نے کہا۔ "شکر ہے۔ آج سورج بادلوں کی اوٹ میں ہے۔ ورنہ گرمی سے میرا برا حال ہو جاتا اس سفر میں۔"
یکایک ریکھا نے رک کر میرے لبوں پر انگلی رکھ دی۔ آہستہ سے سرگوشی کے

لہجہ میں بولی۔

"چپ رہو۔"

میں کسی قدر حیرت زدہ کھڑا رہا۔ وہ جیسے کان لگائے ہوا میں بہنے والی صداؤں کو سنتی رہی۔

"گھوڑوں کی چاپ پیچھے سے آرہی ہے۔ ریکھا ایک دم نیم سرگوشی میں بولی۔ پھر جلدی سے مجھے ایک طرف گھسیٹ کر بولی۔ "اِدھر آؤ۔"

وہ تیزی سے موڑ کاٹ کر مجھے چٹانوں سے گھری ہوئی ایک غار میں لے گئی۔ ہم دونوں دم سادھے ایک دوسرے کے قریب کھڑے انتظار کرتے رہے۔ اس وقت تک مجھے خطرے کا احساس نہ تھا۔ صرف اس کے بدن کی قربت کا احساس تھا۔ اور تیز تیز سانسوں کے درمیان اس کے سینے کے زیر و بم کا۔ یکایک ہمارے قریب سے، بالکل قریب سے دو اٹھی ہوئی چٹانوں کے بیچ سے دو گھوڑ سوار گزر گئے۔ وہ عقابی نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھتے جاتے تھے۔ اور دونوں کندھوں پر بندوقیں تھیں۔ اور گھوڑوں کی پشت پسینے سے بھیگی ہوئی تھی۔ جیسے وہ وادی سے یہاں تک کا فاصلہ بہت جلدی میں طے کر کے آئے ہوں۔!

میں نے انہیں نہیں پہچانا مگر ریکھا نے پہچان لیا۔

"یہ تو ہمارے کارندے تھے۔" جب وہ دونوں بہت آگے نکل گئے تو ریکھا نے آہستہ سے مجھ سے کہا۔

"بگھیلا اور پرسو۔ مگر یہ یہاں کیا کر رہے ہیں۔؟"

اس لمحہ یکایک مجھے خطرے کا احساس ہوا اور میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔
"ممکن ہے یہ ہماری تلاش میں آئے ہوں۔" میں نے ریکھا سے کہا۔
"مگر کیوں۔؟"
"ممکن ہے انہیں راوت والے معاملہ کا اصل قصّہ معلوم ہو گیا ہو۔"
"یہ ناممکن ہے میری ماں کچھ بتانے والی نہیں ہیں۔"
"ممکن ہے انہیں محض کچھ شبہ ہوا ہو۔ آخر راوت ہمارے پیچھے پیچھے شکار گھر گیا تھا۔"
ریکھا چپ رہی۔
میں نے کہا۔ "یہ بھی ہو سکتا ہے۔ راوت آزاد کرا لیا گیا ہو اور اس نے ہی ان دونوں کارندوں کو ہمارے تعاقب میں بھیجا ہو۔"
ریکھا نے سوچ سوچ کر کہا۔
"کچھ بھی ہو۔ مجھے اِن دونوں کی نیت ٹھیک نہیں معلوم ہوتی۔"
"اب کیا کرینگے۔؟" میں نے ریکھا سے پوچھا۔
ریکھا قدرے توقف کے بعد بولی۔
"اب تو وہ کافی آگے نکل گئے ہوں گے۔ آؤ دیکھیں، وہ کیا کرتے ہیں۔؟"
کچھ دُور چلنے کے بعد جب اُترائی ختم ہونے لگی تو ہم دونوں ایک اونچے ٹیلے کی اوٹ میں ہو گئے۔
یہاں سے میلوں تک کا منظر صاف دکھائی دیتا تھا۔ اُترائی ختم ہوتے ہی دھولیا ندی کا تیزی سے بہتا ہوا پانی نظر آتا تھا۔ دوسرے

کنارے دھولیا گاؤں تھا۔ آگے جگہ جگہ کھجوروں کے کنج تھے۔ پھر دور تک
رتیلے میدان۔ نگاہ کی آخری حد شپارا قصبہ۔

ہم نے ان دونوں کارندوں کو اپنے گھوڑوں کو ندی کے تیز پانی
میں ڈالتے ہوئے دیکھا۔ انہیں دوسرے کنارے جاتے ہوئے دیکھا۔ پھر انہیں
دھولیا گاؤں کی چوہدی پار کر کے رتیلے ٹیلوں سے اٹے ہوئے میدان میں
تیزی سے گھوڑے دوڑاتے ہوئے دیکھا۔ راستہ میں رک رک کر وہ
اِدھر اُدھر دیکھتے جاتے تھے جیسے انہیں کسی کی تلاش ہو۔

ریکھا نے کہا ——— "وہ یقیناً ہمیں ڈھونڈھ رہے ہیں۔ مگر کیوں۔ ؟"
میں سارے معاملہ سے واقف تھا مگر ریکھا نہیں تھی۔ اور سروجا دیوی نے
مجھے ریکھا کو کچھ بتانے سے منع کر دیا تھا۔ ریکھا کو صحیح حالات بتا دینے سے اس
کی زندگی سدا کے لئے زہر آلود ہو جاتی۔

"مگر کیوں۔ ؟" ریکھا نے مجھ سے دوبارہ پوچھا۔ وہ عجیب شش و پنج
میں مبتلا ہو گئی تھی۔

میں نے کہا۔ "میں کیا بتا سکتا ہوں۔ کارندے تمہارے ہیں۔"
وہ بولی۔ "مجھ سے الگ ہو کر تمہاری اور ماں کی کیا باتیں ہوئیں۔"
میں نے جھوٹ موٹ ہی کہہ دیا۔ "میں نے ان سے کہا راوت کو پولیس
میں دیدینا چاہیئے۔ وہ بولیں۔ جب تک تم میری بچی کو سسرال چھوڑ کے واپس
شپارا سے پولیس لے کر نہ آجاؤ میں کچھ نہیں کروں گی۔"
ریکھا نے کہا۔ "ٹھیک ہی تو کہا انہوں نے۔" پھر اور میرے قریب آکر بولی۔

"اور کیا کہا انہوں نے۔؟"

"اور زمینوں کے متعلق باتیں ہوئیں۔ زمین کا نرخ۔ بھاؤ۔ مول تول، میں نے پھر جھوٹ بولا۔

مگر اب ریکھا کو میری باتوں میں کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی۔ وہ ریتیلے میدانوں سے گزرتے ہوئے دو گھوڑ سواروں کو دیکھ رہی تھی۔

بولی ـــــ "وہ سیدھے شپارا جا رہے ہیں۔ بگٹٹ بھاگتے جا رہے ہیں۔ اُن کا خیال ہے کہ وہ ہمیں شپارا جانے سے پہلے پکڑ لیں گے۔"

"اور تمہارا کیا خیال ہے۔؟ وہ پھر بولی۔

"میرا خیال ہے کہ سب سے پہلے ناشتہ کر لیا جائے۔ پھر ندی پار کر کے ہمیں دھیرے دھیرے اپنے سفر پر چلنا چاہیئے۔ اور ذرا چکر" کاٹتے ہوئے راستہ بدل کر ہم لوگ دوپہر کے بجائے رات کو شپارا پہونچیں گے۔ کیوں۔؟"

"ٹھیک خیال ہے۔ خصوصاً ناشتہ کے بارے میں تو تمہارا بہت ہی نیک خیال ہے۔ اس وقت مجھے اتنی بھوک لگی ہے کہ میں ناشتہ کے ساتھ ساتھ تمہیں بھی کھا سکتا ہوں۔"

"راستہ بھر اور کیا کرتے رہے ہو۔" ریکھا چمک کر بولی۔ "میرے پیچھے چلتے ہوئے تمہاری نگاہیں برابر مجھے کھاتی رہی ہیں۔"

"تمہیں کیسے معلوم۔؟"

"میری پیٹھ میں سوئیاں سی چبھنے لگی تھیں۔" وہ شریر مگر افسردہ نگاہوں سے میری طرف تاکتے ہوئے بولی۔

میں نے کہا ـــــــ "میں کیا کروں. تمہاری چال ہی اتنی خوب صورت ہے. اتنی خوب صورت عورت کی اتنی عمدہ چال میں نے بہت کم دیکھی ہے. اکثر عورتیں تو بطخ کی طرح چلتی ہیں."

وہ بولی. "اکثر مرد کتے کی طرح ہانپتے ہوئے چلتے ہیں."

میں نے ہاتھ اٹھا کر کہا. "میری توبہ. !"

ہم دونوں ہنسنے لگے.

پھر ناشتہ دان کھول کر کھانا کھانے لگے. کبھی انگلیاں انگلیوں سے لپٹ جاتیں کبھی آدھا لقمہ میرے ہاتھ میں آجاتا. آدھا اس کے ہاتھ میں سالن، روٹیاں، احساس، جذبات، نگاہیں، لمس، ذائقے سب گڈمڈ ہو رہے تھے. وقت ایک ناشتہ دان کی طرح ہم دونوں کے بیچ تھا اور اس کا ذائقہ بڑا ہی لذیذ تھا. پھر جب اپنی اپنی انگلیاں چاٹتے ہوئے ہم مسرور نگاہوں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھتے تو ان نگاہوں کے ملن میں بوسے کی سی حلاوت اور حدّت محسوس ہونے لگی. اور میرے ذہن میں وہ خوابناک رات آئی جب اس رسوئی گھر میں ریکھا نے میرے ساتھ کھانا کھایا تھا. پتہ نہیں وہ لمحہ حقیقت تھا یہ لمحہ بھی ایک خواب ہے.

ریکھا نے یکایک اپنی چھوٹی سی سرخ زبان سے ایک چٹخارہ لیا.

بولی. "اب نیچے ندی پر جا کر پانی پئیں گے."

"اور یہ خالی ناشتہ دان. ؟"

ریکھا نے ناشتہ دان اٹھایا اور اُسے گھما کر دُور پھینک دیا. ناشتہ دان

لڑھکتا لڑھکتا، چٹانوں سے گرتا پڑتا، زخمی ہوتا چیختا چلاتا ایک کھڈ میں گر کر خاموش ہوگیا۔ اور اسی وقت میرے اور اس کے درمیان وہ لمحہ بھی مرگیا۔

اب وہ ریکھا، ریکھا تھی۔ مجھ سے الگ۔ میں اس سے الگ جانے آگے جاکر زندگی کے کس مدار پر ہم دونوں پھر ایک دوسرے سے ملیں گے۔؟

ریکھا اٹھ بیٹھی۔ اس نے اٹھ کر اپنے سرخ اور صندلی لہنگے سے مٹی جھاڑی۔ دھنک کے رنگوں کی طرح ایک انگڑائی لی۔ اور اپنی چوٹی کو جھلاتے ہوئے بولی۔

"چلو، ہماری خاندانی زمینوں کے ہونیوالے مالک اَب آگے بڑھو۔"

میں نے کہا ــــــ "زمینوں کے مالک ہونے سے کیا ہوتا ہے۔ اگر میں تمہارے خاندان میں شامل نہ ہوا تو۔؟"

ریکھا نے زبان نکال کر میرا منہ چڑایا اور آگے آگے چلنے لگی۔ ڈولتے ہوئے اور زیادہ ڈولتے ہوئے (جیسے اب اس کی چال میں میری تعریف کی آگہی بھی شامل تھی۔ یونہی مور ناچتا ہے۔ کبوتر گلا پھلاتا ہے۔ اور عورت بدن چراتے ہوئے چلتی ہے۔ حسن کسی دوسرے کی نگاہ کے بغیر نامکمل ہے۔ سپاٹ ہے۔ عورت کے سارے خم مرد کی نگاہ میں بیدار ہوتے ہیں۔)

یکایک آخری موڑ کاٹ کے ندی ہماری نگاہوں کے سامنے آگئی۔ اور اس کے چڑھتے پانی کو دیکھ کر یکایک ریکھا سر پکڑ کر ندی کے کنارے بیٹھ گئی۔

○
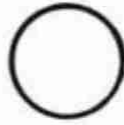
اُدھر پورب میں جو بارش ہوئی تھی اور ابھی تک جاری تھی۔ اس کی وجہ سے دھولیا ندی بڑی منہ زور اور پُر شور تھی۔ اور پہاڑیوں کی مٹی بہالانے سے اس کا پانی بھی بے حد گدلا ہو گیا تھا۔ اس پانی سے پیاس بجھانے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ لیکن جس تیز پانی سے یہ چڑھی ہوئی ندی بہہ رہی تھی، اس کو تیر کر عبور کرنے کا سوال بھی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

ریکھا مایوسی سے بولی۔ "اب کیا کریں۔؟"

میں چپ رہا۔

ریکھا قدرے توقّف کے بعد بولی۔ "بتاؤ نا اب کیا کریں۔؟"

میں نے کہا ——— "اب کواڑی قلعہ کے راستہ سے بھی نہیں جا سکتے اوّل تو میلوں واپس جانا ہوگا۔ پھر ممکن ہے کواڑی قلعہ والی ندی اس ندی کی طرح چڑھی ہوئی ملے۔ وہ راستہ بھی لمبا ہے۔ آج تو کسی حالت میں بھی

شپارا نہیں پہونچ سکتے۔"

ریکھا نے کہا۔ "بس ایک ہی صورت ہے۔ اس ندی کے کنارے بیٹھ کر آرام کرتے ہیں۔ جب ندی اُتر جائے گی اسے پار کرلیں گے۔"

قریب میں کھجوروں کا ایک کنج تھا۔ ہم اس میں چلے گئے۔ یہاں ایک جنگلی جھاڑی پر پھول کھلے تھے۔ ریکھا نے پھولوں کا ایک شگوفہ توڑ کر اپنے بالوں میں لگالیا۔ اور میری طرف عجیب نگاہوں سے دیکھنے لگی۔

میں نے اس کے قریب جاکر کہا ــــــ "جب جذبات کی ندی چڑھی ہو تو اس وقت کیا کرتے ہیں۔؟"

وہ ہنس کر بولی ــــــ "اس وقت کا انتظار کرتے ہیں جب ندی اُتر جائے۔"

اتنا کہہ کر وہ مجھ سے کتراکر نکل گئی۔ اور ایک چھوٹے سے ٹیلے پر بیٹھ کر وہ کچھ گنگنانے لگی۔ کوئی لوک گیت تھا شاید جس کے بول میں سمجھ نہ سکا۔ ہاں اس کا درد میرے دل کو چھو رہا تھا۔ جب ایک گیت ختم ہوا تو دوسرا شروع ہوگیا۔ دوسرے کے بعد تیسرا۔ اسی طرح چار پانچ گیت اس نے اپنی گہری مدھم آواز میں مجھے سُنا ڈالے۔ اب یہ تو معلوم نہیں کہ وہ یہ گیت مجھے سُنا رہی تھی یا اپنے آپ کو۔ شاید کوئی عورت کسی دوسرے کو گیت نہیں سناتی ہے۔ اپنے دل کے محسوسات کو زبان دینے کے لئے گاتی ہے۔ گاتے گاتے اس کی نگاہیں میری طرف دیکھتے ہوئے نوکدار ہوجاتیں، جیسے ٹوٹے ہوئے سپنوں کے کنارے۔ مجھے ایسا لگا جیسے ان کناروں کو چھوتے ہی میرے احساس کی انگلیاں زخمی ہوجائیں گی۔ اور ان سے رِس کر لہو ٹپکنے لگے گا۔ کتنی شکایت تھی ان نگاہوں میں۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا رکھا۔

جانے تو کس سے شکایت کر رہی ہے۔ ؟ ریکھا اس وقت ایک زخمی پرندے کی طرح معلوم ہو رہی تھی۔

کوئی ڈیڑھ گھنٹے کے بعد ہم دونوں نے ندی کے کنارے جا کر معائنہ کیا۔ ندی کی تیزی میں کافی کمی آ چکی تھی۔ مگر میرے خیال میں ندی کی روانی تیرنے کے لئے ابھی تک خطرناک تھی۔ ریکھا ندی عبور کرنے کے لئے بڑی بے چین معلوم ہوتی تھی۔

بولی۔ "چلو، پانی کافی اُتر گیا ہے۔ تیر کر پار کریں گے اِسے۔"

میں نے کسی قدر ہچکچا کر کہا۔ "میرے خیال میں تو ابھی تیر کر پار جانے کی کوشش کرنا خطرے سے خالی نہیں ہے۔ کچھ دیر اور انتظار کریں۔"

ریکھا نے میری بزدلی کا اندازہ لگایا۔ حقارت سے بولی۔ "کیا تمہیں تیرنا نہیں آتا۔ ؟"

میں نے کہا۔ "سچ تو یہ ہے کہ میں نے آج تک کسی دریا یا ندی کو تیر کر پار نہیں کیا ہے۔ یوں تالاب میں ٹھہرے ہوئے پانی میں اکثر نہایا ہوں۔ اور تیرنے کی مشق بھی کی ہے۔ مگر وہ اور بات ہے۔"

ریکھا بولی۔ "کوئی بات نہیں۔ میں تمہیں سہارا دے کر پار لے جاؤنگی۔"

میں نے پوچھا۔ "تم تیرنا جانتی ہو۔ ؟"

وہ بولی ——— "بطخ کی طرح۔ اور پھر یہ تو بچپن سے اب تک سیکڑوں بار پار کی ہے۔ یہاں پانی زیادہ گہرا نہیں ہے۔ تیز ضرور ہے۔ زیادہ دیر انتظار کرینگے تو ممکن ہے یہیں رات ہو جائے یا پہاڑوں پر اتنی بارش ہو جائے

یہ ندی اب سے دگنی چڑھ جائے۔"

ریکھا کی باتوں میں وزن تھا۔ میں نے کپڑے اُتار کر سر پر باندھ لئے۔ صرف ایک انڈر ویر رہنے دیا۔ ریکھا نے اپنے کپڑے تو نہیں اتارے۔ ہاں اپنے لہنگے کو ایک لنگوٹی کی طرح اوپر اڑس لیا اور کپڑوں کی گٹھری سر پر باندھ لی۔ میں اس کی سفید ٹانگوں کے سڈول پن کو سراہنے لگا۔ مگر دوسرے لمحے میں ریکھا نے پانی میں چھلانگ لگا دی۔ اس کے فوراً بعد میں نے بھی۔ گو میرا دل اندر سے بہت ڈر رہا تھا۔

پانی کا دھارا بہت تیز تھا۔ اور ہماری کوشش کے باوجود ہمیں اپنی روانی میں بہائے لئے جا رہا تھا۔

ریکھا دوسرے کنارے جانے کی بڑی کوشش کر رہی تھی۔ مگر شاید ہم نے پانی کی تیزی کا اندازہ کرنے میں غلطی کی تھی۔ پانی کی پُرشور روانی نے ریکھا کو جیسے ہی دو چار تھپیڑے دیئے کہ اس کے قدم اکھڑ گئے اور وہ بہتی ہوئی آگے چلی گئی۔ پانی کے رحم و کرم پر دو ایک ڈبکیاں بھی اُسے لگیں۔

میں نے کنارے پر جانے کا خیال چھوڑ دیا۔ اور تیزی سے ہاتھ پاؤں مار کر ریکھا کے قریب جانے کی کوشش کرنے لگا۔ ہم لوگ اب بیچ دھار میں پہنچ گئے تھے۔

یکایک پانی کے ایک تیز ریلے نے مجھے اس کے قریب کر دیا۔ میں نے اسے پکڑنے کی کوشش کی مگر اس کوشش میں اس کی کرتی کا ایک کونا ہی میرے ہاتھ لگا۔ دوسرے لمحہ میں کرتی چرر کرتی ہوئی پیچھے سے پھٹ گئی۔

میں پھر انتہائی کوشش کر کے تیرتا ہوا اس کے پیچھے بھاگا۔ بڑی مشکل سے میں نے اسے جا لیا۔ اتنے میں وہ دو چار ڈبکیاں اور کھا چکی تھی۔ اور مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے اس کا دم ٹوٹ رہا ہے۔

اگر میں خود زیادہ کریڈٹ لے لوں تو غلط ہو گا۔ ممکن ہے اسے بچانے میں تھوڑا سا میرا دخل رہا ہو۔ مگر حقیقت تو یہ ہے کہ قدرت نے اسی لمحہ ہم دونوں کو بچا لیا۔ پانی کا ایک اور ریلا منجدھار کو کاٹتا ہوا آیا۔ اور ندی کے دوسرے کنارے چلا گیا۔ اسی کے سہارے ہم دونوں بھی دوسرے کنارے تک بہتے ہوئے چلے گئے۔ پھر کنارے کی جھاڑیوں کی ڈوبی ہوئی شاخوں کو پکڑ کر دوسرے کنارے پر چڑھ گئے۔

پہلے میں دوسرے کنارے پر اُترا پھر میں نے دونوں ہاتھوں سے ریکھا کو اُوپر کھینچا۔ اس کھینچا تانی میں اس کی کرتی جگہ جگہ سے پھٹ گئی۔ خصوصاً پُشت پر سے۔

اوپر، کنارے پر لا کر میں نے اُسے چھوڑ دیا۔ وہ بے دم بے حال ہو کر اوندھی لیٹی ہوئی تھی۔ اور ایک جھاڑی کے پتوں میں منہ چھپا کر قے کر رہی تھی۔ اور اس کی کرتی پشت پر سے جگہ جگہ سے پھٹ گئی تھی۔

یکایک میں نے دیکھا کہ اس کی پشت پر نیلگوں دھاریاں سی پڑی ہوئی ہیں۔ جیسے کسی نے اُسے چابک مار مار کر پیٹا ہو یا ناخنوں سے کھرونچا ہو کہیں گرنے میں رگڑ کھانے سے پشت پر جگہ جگہ چوٹ آئی ہو۔ زخم اب مندمل ہو چکے تھے۔ مگر کہیں کہیں نیلگوں دھاریاں اب تک ابھری ہوئی تھیں اور کہیں کہیں پر سرخی

بھی باقی تھی۔

میں ان نیلگوں دھاریوں کو دیکھ کر چونک پڑا۔ مگر اس وقت میں نے اس سے کچھ نہیں کہا۔ وہ خود ہی منہ میں انگلی ڈال کر اپنے پیٹ سے پانی نکالنے کی کوشش کرتی رہی۔ پھر جب اس کا سانس پھول گیا تو بے سدھ ہو کر لیٹ گئی۔

اتنے میں سورج نکل آیا۔ بادل جگہ جگہ سے پھٹ گئے۔

دیر تک ہم دھوپ میں بے سدھ پڑے رہے اور دھوپ اور ہوا ہمارے بدن کے کپڑے سکھاتی رہی۔ پھر جب دھوپ کی نوک دار کرنیں ہمارے جسم میں سوئیاں چبھونے لگیں تو ہم ندی کے کنارے اٹھ کر چند قدم چل کر درختوں کے ایک جھنڈ تلے بیٹھ گئے۔ ریکھا نے اپنی اوڑھنی پھیلا کر سکھانے کے لئے رکھ دی۔ پھر اپنا لہنگا بھی۔ اب وہ صرف اپنی پھٹی کرتی اور پیٹی کوٹ میں تھی۔ اور ابھی تک لرز رہی تھی۔ اور بہت ہی معصوم اور بیچاری سی لگ رہی تھی۔ اسے اس طرح کانپتے دیکھ کر میرا دل پگھلنے لگا۔

ہم دونوں ایک درخت کے تنے سے ٹیک لگائے بیٹھے تھے۔ اس نے اپنی نگاہیں مجھ سے چرالیں تھیں۔ جیسے اس نے ان چرائی ہوئی نگاہوں کی ایک اوٹ بنالی ہو اور اس میں اپنے آپ کو چھپالیا ہو۔

میں نے اس سے پوچھا۔ "تمہاری پیٹھ پر یہ نیلگوں نشان کیسے ہیں۔ ؛ جیسے کسی نے تمہیں چابک سے مارا ہو۔"

فوراً اس کا ہاتھ اپنی پشت پر گیا۔ کرتی کو پشت پر سے جگہ جگہ سے پھٹا ہوا محسوس کر کے اس کی نگاہیں جھک گئیں۔ اس کا چہرہ بھی جھک گیا۔ اور

وہ دونوں ہاتھوں سے اپنا منہ چھپا کے رونے لگی۔

مجھ سے نہ رہا گیا۔ میں نے آگے بڑھ کے اسے اپنی بانہوں میں سمیٹ کر اپنے سینے سے لگا لیا۔ میرے سینے سے لگی وہ دیر تک دھیرے دھیرے سسکتی رہی۔

"بتاؤ ـــــ ریکھا۔ کیا بات ہے۔؟ یہ زخموں کے نشان کیسے ہیں۔؟"

اس نے اپنی سسکیاں روک کر اور آنسو پونچھتے ہوئے گلوگیر لہجہ میں کہا۔

"وہ ـــــ وہ ـــــ مجھے مارتے ہیں۔"

"وہ کون۔ تمہارے پتی۔؟" میں نے پوچھا۔

اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"تمہارے پتی۔ تمہیں مارتے ہیں۔؟ اس پھول ایسے بدن کو۔؟" میں حیرت زدہ رہ گیا۔

"ہاں۔" اس کی آنکھوں میں پھر آنسو بھر آئے۔

"کیوں۔؟"

اس نے کچھ نہ کہا۔ اور بھی زیادہ سمٹ کر میرے سینے میں منہ چھپا لیا۔ اور سسکیاں لینے لگی۔

"کیوں ریکھا۔ کیوں وہ ایسا کرتے ہیں۔؟"

روتے ہوئے بولی ـــــ "اگر وہ ایسا نہ کریں تو میرے ساتھ سو نہیں سکتے۔"

میں سکتے میں رہ گیا۔ پہلے لمحہ میں مجھے یقین نہ آیا۔ وہ کیا کہہ رہی ہے۔

"یعنی۔ یعنی کہ۔" میں نے اپنا شبہ دور کرنے کے لئے دوبارہ اس سے پوچھا۔

"وہ تمہیں چابک سے مارتے ہیں۔؟"

"ہاں۔!" وہ بولی۔

"کبھی کبھی تو مار مار کر چابک سے میری پیٹھ ادھیڑ دیتے ہیں۔ اور جتنا زیادہ مارتے ہیں اتنا ہی اُن میں جوش پیدا ہوتا ہے۔"

وہ زور زور سے رونے لگی۔

"یہ بڑی بے رحمی ہے۔" میں نے کہا۔

وہ روتی رہی۔

"اور تم اسے برداشت کرتی ہو۔؟"

وہ روتی رہی۔

"ایسے ظالم آدمی کو تو گولی ماردینی چاہیئے۔"

وہ اور زور زور سے رونے لگی۔

میں نے اسے زور سے لپٹا کر کہا۔ "تمہیں ایسے غلیظ، بیمار اور ظالم آدمی کے پاس ایک منٹ کے لئے بھی نہیں رہنا چاہیئے۔"

"نہیں، نہیں۔ میں تمہیں تمہاری سُسرال نہیں لے جاؤں گا۔ تم میرے ساتھ چلو گی۔"

میں نے ایک انگلی کے سہارے سے اس کی ٹھوڑی اٹھائی۔ اس کے رخساروں پر بہتے ہوئے آنسو صاف کئے پھر اس کے نازک گلابی ہونٹوں کی طرف میرے ہونٹ جانے لگے۔

یکایک ریکھا کا سارا بدن کانپا۔ اس نے یکدم اپنا چہرہ جھکا کر پھر

میرے سینے میں چھپالیا۔ اور گھٹے گھٹے لہجہ میں بولی۔

"بابو مجھے کلنک مت لگانا۔"

یکایک میں نے اپنے آپ پر قابو پالیا۔ اس کے بدن کے گرد میری گرفت بھی ڈھیلی پڑگئی۔ میں دیر تک اس کی پشت پر ہاتھ پھیرتا رہا۔ حتیٰ کہ اس کی بچّوں کی سی سسکیاں تھم گئیں اور آنسو بھی خشک ہوگئے۔ پھر میں نے اسے اپنے بازوؤں کے گھیرے سے آزاد کردیا۔ وہ دیر تک درخت سے ٹیک لگائے مجھ سے اپنا چہرہ پھیرے لمبے لمبے سانس لیتی رہی۔ پھر اس نے قریب میں پڑی، آدھی سوکھی آدھی گیلی اپنی اوڑھنی اٹھاکر اپنی پھٹی ہوئی کرتی کے گرد لپیٹ لی۔ جیسے میرے اور اپنے درمیان ایک اور دیوار کھڑی کرلی ہو۔ مگر میں نے کچھ ایسا محسوس کیا اور پہلی بار محسوس کیا جیسے یہ کوئی بہت بڑی اور مضبوط دیوار نہیں تھی۔ جذبات کے ایک ہی ریلے سے بہہ سکتی تھی۔ ابھی ایک منہ زور ندی ہمارے بدنوں سے ٹکرائی تھی۔ بہتے بہتے چند لمحوں کے لئے ہمارے دل یکجا ہوگئے تھے۔ اور کسی اجنبی جذبے کے اجالے نے ہماری روحوں کو چھولیا تھا۔ اور جب وہ میری گود میں آئی تھی۔ تو اس کی سانسوں میں کتنی اپنائیت تھی۔ مجھ سے دور جاکے بھی وہ اب کبھی مجھ سے اجنبی نہ ہوسکے گی۔ کسی مہربان جذبے کے پیڑ نے ہم دونوں کو اپنے سائے میں لے لیا تھا۔ اپنائیت کا یہ احساس بڑی مشکل سے پیدا ہوتا ہے۔ اور جب پیدا ہوتا ہے۔ تو بڑی مشکل سے جاتا ہے۔ اب مجھ سے کتنی بھی دور تم چلی جاؤ ریکھا۔ یہ لمحہ ہم دونوں کا پیچھا ضرور کریگا۔ اور دل میں ایک گھنٹی کی طرح صدا دیگا۔

اگلے دو ڈھائی گھنٹوں تک میں نے اس سے کوئی بات نہیں کی۔ میں اپنے کپڑے دھوپ میں سکھاتا رہا۔ وہ اپنے کپڑوں کی گٹھری کھول کر، دو جوڑے جو اس میں بندھے تھے۔ انہیں الٹ پلٹ کر سکھاتی رہی۔

پھر تنے کے دوسری طرف جاکر مجھ سے بولی۔ "ادھر مت دیکھنا میں کپڑے بدل رہی ہوں۔"

چند منٹوں میں اس نے کپڑے تبدیل کر لئے۔ پھٹی کرتی کی جگہ نئی قمیص اور لہنگے کی جگہ چوڑی دار اور پرانی اوڑھنی کی جگہ نئی اوڑھنی۔ پھر مجھ سے آنکھیں ملا کر بولی۔

"چلو اب چلیں۔ ورنہ راستہ ہی میں رات پڑ جائے گی۔"

ہم دونوں نے قدم بڑھائے۔ آگے جاکر ہم دھولیا گاؤں کے اندر نہیں گئے۔ بلکہ اس سے کنّی کاٹ کر اور گھوم کر آگے بڑھ گئے۔ کیونکہ ریکھا نے کہا تھا کہ راستہ میں جتنے کم آدمیوں سے ملاقات ہو اچھا ہے۔ اور میں نے بھی ان آگے جانے والے گھوڑ سواروں کی موجودگی میں اسے بہتر جانا۔

یہاں سے رتیلا علاقہ شروع ہوتا تھا۔ رتیلا اور غیر آباد۔ چلتے چلتے سہ پہر ختم ہو گئی۔ سورج مغرب کی طرف جانے لگا۔ اب تک راستہ میں کہیں پانی پینے کو نہ ملا تھا۔ اس لئے اب جو راستہ میں ایک کنواں نظر آیا تو ہم دونوں نے اطمینان کی سانس لی۔ پیاس سے حلق میں کانٹے پڑ رہے تھے۔ خوش قسمتی سے رہٹ چل رہا تھا۔ یہاں کنوئیں کے قریب بیٹھ کر دم لیا۔ اور اچھی طرح سے پیاس بجھائی۔

ریکھا نے رہٹ چلانے والے لڑکے سے پوچھا۔ "تم نے کوئی دو گھوڑ سوار ادھر

دیکھے تھے۔؟"

"ہاں۔چند گھنٹے ہوئے اِدھر سے گزرے تھے۔"

"کیا پوچھتے تھے۔؟"

لڑکا پہلے تو چپ رہا۔غور سے ہم دونوں کی طرف دیکھتا رہا۔پھر بولا۔

"شاید تم دونوں کو پوچھتے تھے۔پوچھتے تھے کوئی نوجوان مرد اور لڑکی اِدھر سے گئے ہیں۔میں نے نا کر دی کیونکہ تم لوگ تو اب آئے ہو۔"

ریکھا نے میری طرف اور میں نے ریکھا کی طرف غور سے دیکھا۔جیسے دونوں کے دل میں ایک ہی خیال آیا ہو۔پھر ریکھا بولی۔

"دیکھو۔اگر وہ دوبارہ لوٹ کر تمہارے پاس آئیں تو انہیں ہمارے بارے میں کچھ مت بتانا۔"

میں نے لڑکے کو ایک روپیہ دیا۔ وہ بولا۔

"اچھّا نہیں بتاؤں گا۔"

چلتے چلتے ہم دونوں تھک گئے تھے۔اس لئے یہاں کنوئیں کے کنارے درختوں کی چھاؤں میں چند گھڑی آرام کرنا مناسب سمجھا۔میں کمر سیدھی کرنے زمین پر لیٹ گیا۔وہ بھی میرے قریب میری طرف کروٹ لے کر لیٹ گئی۔

میں اس کے شوہر کے بارے میں سوچنے لگا۔اس نفسیاتی حالت کے بارے میں تو میں نے اکثر پڑھا تھا جسے انگریزی میں MASOCHISM کہتے ہیں۔ جس میں اپنے بدن کو تکلیف پہونچا کر جنسی بیداری پیدا کی جاتی ہے۔اور اس حالت کے بارے میں بھی سنا تھا۔جس میں کسی دوسرے کو تکلیف پہونچا کر اور

اذیت دیکر جذبات بیدار کئے جاتے ہیں۔ یہ بھی SADISM یعنی سادیت کی ایک ظالمانہ صورت ہے اور جنسی کجروی کی بدترین مثال ہے۔ مگر پڑھنے لکھنے اور دیکھنے میں بہت فرق ہے۔ ریکھا کی پشت کے نیلگوں نشان دیر تک میرے احساس کی پشت پر چابک کی طرح برستے رہے۔ گھبرا کر میں نے اپنی آنکھیں بند کرلیں۔

"کیا ہوا۔؟" ریکھا نے میرے متغیّر چہرے کو دیکھ کر کہا۔

"کیسے اب تک برداشت کیا تم نے۔؟"

"تو اور کیا کرتی۔؟" وہ تلخ لہجہ میں بولی۔

"اسے گولی ماردی ہوتی۔"

"یہ مت بھولو ــــــ کہ اس سے میرا ایک بچّہ بھی ہے۔ میں اپنے بچّے کے باپ کی قاتل کیسے بن سکتی ہوں۔؟"

"یہ ایک غیرانسانی حرکت ہے تمہیں اس سے الگ ہوجانا چاہیئے۔"

"الگ ہو کے جاؤں کہاں۔؟"

"کیا تمہاری ماں کو معلوم ہے۔؟"

"نہیں، میں نے اس سے کچھ بتایا نہیں ہے۔ تمہیں بھی نہ بتاتی۔ اگر۔ اگر......" وہ چپ ہوگئی۔

"کیا پہلے دن ہی سے ایسا ہوا تھا۔؟"

"ہاں۔ پہلے دن ہی سے۔" وہ بولی۔ "میں سمجھتی تھی شاید سب ہی مرد ایسا کرتے ہوں گے۔ دھیرے دھیرے جب جبرآباد کی دوسری سہیلیوں سے بات چیت ہوئی تو پتہ چلا کہ میں ہی اس معاملہ میں بدقسمت ہوں ورنہ دوسری لڑکیوں کے

خاوند تو ان سے بہت پیار کرتے ہیں۔"

اس کی آواز بھرا گئی اور وہ چپ ہو گئی۔

پھر بولی۔ "پہلے تو مجھے دنیا کے سارے مردوں سے نفرت ہو گئی تھی، پھر جب میں نے اپنی دوسری سہیلیوں کو اپنی بد قسمتی بتائے بغیر بڑی احتیاط سے پوچھ گچھ کی تو معلوم ہوا کہ سب ہی مرد ایسے نہیں ہوتے ہیں۔ کوئی کوئی ایسا ہوتا ہے۔"

میں نے کہا ــــــ "ایسے آدمی کو چھوڑ دینا، دنیا، دھرم اور قانون کسی کی نظر میں گناہ نہیں ہے۔ تمہیں ایسے آدمی کے ساتھ ایک پل نہیں رہنا چاہیئے یہ پھول سا بدن پھول کی طرح کھلنے کے لئے بنا ہے۔ چابک کھانے کیلئے نہیں۔"

وہ دھیرے سے بولی۔

"کیا معلوم تم بھی ایسے ہی نکلو۔؟"

میں چونک گیا۔ اس کا یہ جملہ بڑا گہرا تھا۔ عورت کے دل کی طرح اتھاہ اور تہہ در تہہ، پرت دار۔ جانے تم کیا کہہ گئیں ریکھا۔ اس جملے کے تو بہت سے معنی ہیں کئی رنگ ہیں۔ ایسے میرے سامنے دھنک کی طرح اس کے رنگ کھلتے ہی جا رہے ہیں۔

میں نے شریر نگاہوں سے اسے تاکتے ہوئے کہا۔ "کیا سچ مچ تم مجھے ایسا ہی سمجھتی ہو۔؟"

اس کا ہاتھ میرے ہاتھ کی طرف آہستہ سے سرک آیا۔ میرے ہاتھ کی انگلیاں اس کے ہاتھ کی انگلیوں سے کھیلنے لگیں۔ بڑا ہی کمزور میٹھا سا لمحہ تھا وہ۔

میں اس کے ہاتھ کی ریکھائیں ٹٹولنے لگا۔ شاید ان میں کہیں میرے جیون کی بھی کوئی ریکھا ہو۔!

میں دھیرے دھیرے اس کے نزدیک جانے لگا۔
یکایک اس نے اپنا ہاتھ ہٹا لیا۔ گلوگیر لہجہ میں بولی۔
"بابو مجھے کلنک مت لگانا۔"
میں اپنی جگہ جامد رہ گیا۔ وہ لمحہ ایک سسکی بن کر فضا میں گھل گیا۔

٭ ٭ ٭

اب شام کے سائے لمبے ہوتے جا رہے تھے۔ اور ہم تیز تیز قدموں سے شپارا کی طرف جا رہے تھے۔
یکایک ہم نے دُور سامنے سے دُھول اُڑتی ہوئی دیکھی۔ ایسا گمان ہوا جیسے کوئی چرواہا اپنے ریوڑ کو ہنکاتا آ رہا ہے۔ یا کچھ لوگ گھوڑوں پر سوار اِدھر چلے آ رہے ہیں۔ ہم لوگ جلدی سے درختوں کی آڑ میں ہو گئے۔
چند منٹ کے بعد گھوڑوں پر سوار دو آدمی ہمارے قریب سے گزر گئے۔ میں نے اور ریکھا نے دونوں کو پہچان لیا۔ یہ وہی دو کارندے تھے۔ راوت کے، جو غالباً ہمارا اپتہ نشان نہ پا کر مایوس ہو کر واپس جا رہے تھے۔
جب وہ کافی دُور چلے گئے تو ہم دونوں نے ایک دوسرے کی طرف معنی خیز نگاہوں سے دیکھا۔

پھر ریکھا نے اطمینان کا ایک گہرا سانس لیا اور بولی۔
"چلو، اچھا ہوا۔ وہ لوگ واپس لوٹ گئے۔ اب شپارا میں ہمارے لئے کوئی خطرہ نہیں ہے۔"
اب اِکّا دُکّا روشنیاں نظر آنے لگیں۔ شپارا کا قصبہ قریب آ رہا تھا۔

●

○
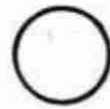
شپارا تک پہونچتے پہونچتے ریکھا بہت تھک گئی۔ بولی ــــــ "آج کی رات یہیں شپارا کی سرائے میں آرام کرینگے۔ صبح دو اونٹ لے کر جیرآباد چلے چلیں گے۔"

"جیرآباد تک کیا اونٹوں کا راستہ ہے۔؟"

ہاں۔ ریکھا بولی ــــــ "میں تو ہمیشہ اونٹ لے کر جاتی ہوں۔ وہ راستہ یہاں سے قریب بھی ہے۔"

مگر میرا خیال تھا ممکن ہے شپارا جنکشن سے جیرآباد تک گاڑی جاتی ہوگی۔ ریکھا کو سرائے میں بٹھا کر ریلوے اسٹیشن گیا۔ معلوم ہوا گھنٹہ بھر میں چھوٹی لائین سے ایک گاڑی جائے گی۔ جو کل صبح جیرآباد قصبہ کے اسٹیشن تک پہونچا دے گی۔ راستہ تو ٹرین سے بھی زیادہ لمبا نہیں تھا۔ مگر چھوٹی لائین کی گاڑی اونٹنی کی رفتار سے بھی آہستہ چلتی ہے۔ پھر بھی میں نے شپارا

سے جبرآباد تک کے ویرانے کو اونٹ کے بجائے گاڑی سے طے کرنا بہتر سمجھا۔ اس لئے میں نے جبرآباد کے دو ٹکٹ کٹا لئے اور واپس سرائے چلا گیا۔

ریکھا تھک کر سو گئی تھی۔ اُسے آہستہ سے جگایا۔ جلدی جلدی سرائے کی بھٹیاری سے کھانا تیّار کرا کے کھایا۔ اور گاڑی جانے میں دس منٹ باقی تھے۔ جب اُسے پکڑ لیا۔

ریکھا نیم غنودگی کے عالم میں تھی۔ وہ تو سارا راستہ میرا ہاتھ پکڑے چلتی رہی تھی۔ اور اسے یہ بھی شاید ٹھیک طرح سے معلوم نہ تھا کہ وہ کب ریلوے اسٹیشن پر آئی۔ کب وہ چھوٹی لائن کی گاڑی میں بیٹھی۔ کب گاڑی چلی۔ وہ فرسٹ کلاس کے ڈبّے میں آتے ہی برتھ پر پاؤں پسار کر سو گئی۔

یہ چھ برتھ کا ڈبّہ تھا۔ تین اوپر تین نیچے۔ ہم سے پہلے چار آدمی اس ڈبّے میں بیٹھ چکے تھے۔ دو ایک برتھ پر، دو دوسری برتھ پر۔

ایک برتھ پر دو ہپّی بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک اُن میں سے تگڑا تھا۔ دوسرا ذرا کمزور تھا۔ اور نازک بدن والا، اس نے اپنے بال اس قدر بڑھا رکھے تھے کہ عورتوں کی طرح جُوڑا بنا لیا تھا۔ ممکن ہے میں اسے عورت ہی سمجھتا۔ اگر اس کے رخساروں پر پتلی سی اور چھدری سی داڑھی نہ ہوتی۔ چہرہ لمبوترا تھا۔ اور آنکھوں کی پلکیں گھنی تھیں۔ اور ہاتھوں کی انگلیاں بھی لانبی تھیں۔ اور آواز بھی پتلی تھی۔ مجھے کچھ ایسا احساس ہوا، جیسے قدرت اسے عورت بناتے بناتے رہ گئی۔

دوسرے ہپّی کے چوڑے چکلے چہرے پر گول گھنی اور سرخی مائل داڑھی تھی۔

اور وہ دوسرے ہپّیوں کے مقابلہ میں کافی مضبوط اور تگڑا معلوم ہو رہا تھا۔ اس کا قد بھی چھ فٹ سے کچھ کم ہی تھا۔ اس نے بھوری سبز اور پیلی دھاریوں والی لنگی پہن رکھی تھی۔ اور ایک میلا گیروے رنگ کا کرتا جس کے سینے کے تینوں بٹن کھلے تھے۔ اور اس میں سے اس کے چوڑے سینے کے بھورے سرخ بال جھانک رہے تھے۔ وہ بڑے محبّت آمیز لہجہ میں اپنے دُبلے پتلے ساتھی سے بات کر رہا تھا۔ اور کبھی کبھی اس کا ہاتھ دُبلے پتلے ساتھی کی کمر تک چلا جاتا تھا۔

دُبلا پتلا ہپّی ایک میلا رومال کھول کر اس میں سے ڈبل روٹی نکال کر اس کے ٹکڑے کرنے لگا۔ اور چاقو سے ٹماٹر اور کھیرے کے ٹکڑے کر کے انہیں ڈبل روٹی کے ٹکڑوں پر مکھّن لگا کر سینڈوچ بنا کر ہٹّے کٹّے ہپّی کو دینے لگا۔

دونوں ہپّی دھیرے دھیرے باتیں کرتے رہے اور سینڈوچ کھاتے رہے۔

دوسری برتھ پر ایک ادھیڑ عمر کا آدمی کلّے میں پان دبائے کھدّر کا پائجامہ اور کھدّر کا لمبا کرتا پہنے ہوئے ہندی کا ایک اخبار پڑھنے میں مستغرق تھا۔ کبھی کبھی قریب کی کھڑکی کھول کر منہ کھڑکی کے قریب لیجا کر پیک تھوک دیتا۔ اس کے سامنے برتھ کے دوسرے کنارے پر شیروانی اور علی گڑھ کٹ کا پائجامہ پہنے کلین شیو آنکھوں میں ذہانت کی چمک لئے ایک ناشتہ دان کھولے کھانا کھا رہا تھا۔ ورقی پراٹھے۔ شامی کباب، بُھنا قیمہ، مٹر اور شلغم کا اچار کھانے کے بعد انہوں نے چاندی کی ایک ڈبیہ نکالی۔ اسے کھول کر اس میں سے مگھئی پان کی ایک جوڑی منہ میں ڈالی اور کچھ دیر کے بعد برتھ کے نیچے رکھا ہوا ایک نقشین اگالدان اٹھایا اور بڑی نفاست سے اسے پیک کے لئے استعمال کیا۔ پھر

اگالدان فرش پر رکھ کر شیروانی کی جیب سے ایک رومال نکالا۔ اس سے مُنہ پونچھا۔ پھر برتھ سے ایک اُردو رسالہ اٹھایا اور اسے پڑھنے میں مصروف ہو گئے۔

دونوں ہپّی دھیرے دھیرے کسی غیر زبان میں باتیں کئے جا رہے تھے۔ میں نے تگڑے ہپّی سے پوچھا۔ "آپ لوگ کس مُلک سے آئے ہیں۔؟"

اس نے بڑی شُستہ انگریزی میں جواب دیا۔ "آسٹریا سے۔"

میں نے پوچھا۔ "کہاں جا رہے ہیں۔؟"

وہ بولا۔ "کلو آپور کا پرانا قلعہ دیکھنے۔"

میں نے چھوٹے ہپّی کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ "یہ آپ کا دوست ہے۔"

تگڑا ہپّی مسکرایا۔ آہستہ سے بولا۔ "نہیں یہ میری بیوی ہے۔"

"بیوی۔؟" میں نے حیرت زدہ ہو کر کہا۔ "یہ تو مرد ہے۔"

"ہاں مرد تو ہے۔ مگر آجکل ترقی یافتہ ملکوں میں دو مرد بھی آپس میں شادی کر سکتے ہیں۔"

یکایک مجھے امریکی اخباروں میں چھپی دو تین اس قسم کی مثالیں یاد آئیں۔ اخباروں میں ان جوڑوں کی تصویریں بھی چھپی تھیں۔ میں چپ ہو گیا۔ آج کل یورپ اور امریکہ میں ہومو یعنی ہم جنسی کا رجحان بہت بڑھتا جا رہا ہے۔ مگر کیا کہنا۔ مشرق میں تو یہ وبا بہت پرانی ہے۔

میں نے قدرے توقف کے بعد پوچھا۔ "کیا آپ لوگ شادی سے پہلے طے کر لیتے ہیں۔ کون مرد ہوگا۔ کون بیوی، حالانکہ آپ دونوں مرد ہیں۔"

تگڑا ہپی بولا۔ "عام طور پر میں ہی شوہر ہوتا ہوں اور یہ بیوی لیکن کبھی کبھی یہ شوہر ہوتا ہے میں بیوی۔ یہ تو باہمی مفاہمت کی بات ہے۔"

میں نے کہا۔ "مگر آپ دونوں جوان ہیں۔ دیکھنے میں ٹھیک ٹھاک ہیں اور گھر سے دنیا کی سیر کرنے نکلے ہیں تو کھاتے پیتے گھروں کے افراد ہوں گے۔ اس لئے آپ دونوں آسانی سے دو عورتوں سے شادی کر کے ......"

اس نے میری بات کاٹ دی بولا۔ "عورت اور مرد کی شادی کی رسم تو بہت پرانی ہو گئی ہے۔ اس میں اب کوئی لطف نہیں رہا۔ دو مردوں کی شادی کا تھرل THRILL ہی دوسرا ہوتا ہے۔ لگتا ہے جیسے ہم نئے تجربوں کی وادی میں داخل ہو رہے ہیں۔ ہماری نسل نئے تجربے کرنا چاہتی ہے۔"

"مگر اخلاق۔؟"

"ہمارے یہاں اخلاق کے پیمانے دوسرے ہیں۔ پرانے یورپی سماج کے سارے بندھن ہم نے توڑ دیئے ہیں۔ ورنہ ہم اپنے گھروں سے دور آج اس کھٹارہ ٹرین میں کیوں بیٹھے ہوتے۔؟"

میں نے کہا۔ "انسانی سماج کے سانچے تم توڑ سکتے ہو۔ لیکن فطرت کے سانچوں کو توڑنا ناممکن ہے۔ اس شادی سے بچے تو پیدا نہیں ہو سکتے۔ گھر بھی نہیں بن سکتے۔ فیملی کی بنیاد بھی نہیں پڑ سکتی۔

"کون گھر بنانا چاہتا ہے۔؟" وہ نازک بدن ہپی بولا۔ "کس کو بچے چاہئیں۔؟ اس دنیا میں پہلے ہی سے بہت زیادہ آبادی ہو چکی ہے۔ جہنم میں جائے فیملی۔ ہمیں اپنی جنسی آزادی چاہیئے۔"

تنگڑا ہپّی بولا۔ گھر کی چہار دیواری آدمی کو مفلوج کر دیتی ہے۔ وہ ایک زنجیر سے بندھ جاتا ہے۔ ایک ڈوری ہے۔ جو نظر نہیں آتی ہے۔ مگر گھر کی چہار دیواری میں رہنے والا آدمی جیل کی چہار دیواری میں رہنے والے انسان سے کسی طرح بہتر نہیں ہے۔ شاید بدتر ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ وہ اپنے پاؤں میں پڑی بیڑی کو نہیں دیکھ سکتا۔ وہ سوچتا ہے کہ وہ آزاد ہے۔ حالانکہ اس کے پاؤں میں ایک مضبوط ڈوری ہے جو اسے گھر سے بازار، دفتر، کارخانے، کھیت میں لے جاتی ہے۔ اور سرِ شام گھسیٹ کر گھر لے آتی ہے۔ وہ آدمی کہاں رہا۔ وہ تو ایک مویشی ہے۔ ہم ڈنگر نہیں رہنا چاہتے۔ ہم گھر نہیں بنانا چاہتے۔ ہم نے اس نظر نہ آنیوالی رسی کو توڑ دیا ہے۔ ہم نے میاں بیوی کی زنجیر کو بھی توڑ دیا ہے۔ آج میں اس کا میاں ہوں اور یہ میری بیوی ہے تو کل یہ میرا میاں ہے اور میں اس کی بیوی ہوں۔ آج ہم یہاں ہیں۔ تو کل کہیں اور۔ ہم کسی گھر کے برآمدے میں، کسی کھیت میں، کسی پیڑ کے نیچے، کسی ندی کے کنارے سو جاتے ہیں۔ اور دوسرے دن پھر آگے چل دیتے ہیں۔ ہم نے گلیوں، سڑکوں بلڈنگوں، لفٹوں، دروازے والے گھروں کی گھٹی فضا سے نجات پالی ہے۔ اور بھالو یا چیتے کی سی آزادی حاصل کر لی ہے۔"

میں نے کہا —— "بھالو کا بھی ایک بھٹ ہوتا ہے۔ وہ بھی دن بھر کام کرتا ہے۔ دن بھر خوراک کی تلاش میں رہتا ہے۔ آدمی بھی وہی کام کرتا ہے لیکن ایک پیچیدہ سطح پر۔ شہروں کی گھٹی زندگی سے میں بھی تنگ آچکا ہوں مگر کام کرنے کے حق میں ہوں۔ ہر آدمی کو صبح سے شام تک کام کرنا چاہیئے۔"

"کیوں۔؟" چھوٹا ہپّی کسی قدر غصّہ سے بولا۔ "سارے کام بیکار اور بالکل بے فائیدہ ہیں۔ ہر کام میں کسی دوسرے کا فائیدہ زیادہ ہے تمہارا اپنا بھلا کم ہے۔ اگر تم دن میں دس یونٹ کام کرتے ہو تو تمہارے حصّہ میں صرف ایک یونٹ آتا ہے۔ اس لئے ہم نے کام بند کر دیا ہے۔"

"پھر کون تمہیں روٹی دیتا ہے۔؟"

"ہمارے ماں باپ ہماری مدد کرتے ہیں اور اگر کبھی دو چار ماہ وہاں سے مدد نہیں آتی تو ہم لوگ بھیک مانگ لیتے ہیں۔ کبھی کبھی ہم لوگ کام بھی کر لیتے ہیں۔ لیکن انتہائی مجبوری کی حالت میں۔"

"دوسرے لفظوں میں تم لوگ دوسروں کی محنت پر زندہ رہنا چاہتے ہو۔"

"ہماری خواہشات بہت کم ہیں۔ صرف ایک یونٹ، باقی نو یونٹ آپ لوگ لے جائیں مگر ہمیں تنہا چھوڑ دیں۔ کیا آپ لوگ ہمیں ایک یونٹ بھی نہیں دے سکتے۔ ہماری خواہشیں بہت کم ہیں۔ ہم صرف یہ چاہتے ہیں کہ ہمیں تنہا چھوڑ دیا جائے۔"

بڑے ہپّی نے چھوٹے ہپّی کی کمر میں ہاتھ ڈال دیا۔ بڑے ہپّی کے کرتے کی ایک آستین پھٹی ہوئی تھی۔ اور اس میں سے اس کی بھورے بالوں والی مضبوط بانہہ دکھائی دے رہی تھی۔ چھوٹا ہپّی اس بانہہ پر اپنی ٹھوڑی رکھ کر اپنی باریک داڑھی کھجانے لگا۔

سامنے والی برتھ پر نیم دراز آدمی جو ہندی کا ایک اخبار پڑھ رہا تھا۔ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اور ہمسائے سے پوچھنے لگا۔

"کیوں صاحب، غریبی کب ہٹے گی۔؟ غریبی ہٹاؤ کا نعرہ تو بالکل ہی فراڈ ثابت ہوا۔"

شیروانی والے صاحب بولے۔" صاحب، غریبی ایک دو سال میں تو ہٹ نہیں سکتی، صدیوں کی غریبی ہے۔"

ہندی کا اخبار تہہ کر کے اپنی انگلی میں پڑی ہوئی سونے کی ایک بڑی سی انگوٹھی کو گھماتے ہوئے دوسرے آدمی نے بڑے جارحانہ ڈھنگ سے کہا۔

"کیوں صاحب، جب غریبی ایک دو سال میں تو ہٹ نہیں سکتی تھی۔ تو اندرا گاندھی نے اس کا نعرہ کیوں لگایا تھا۔؟"

شیروانی والے صاحب بولے۔" یہ نعرہ نہیں ہے۔ ایک مطمح نظر کا اعلان ہے۔ اندرا گاندھی کی ہر بات کی میں حمایت نہیں کرتا لیکن اتنا ضرور جانتا ہوں کہ اگر اندرا گاندھی یہ نعرہ نہ لگاتیں تو کوئی اور لگاتا۔ اور اگر کل کو اندرا گاندھی اپنی گدی سے ہٹ جائیں تو بھی کسی نہ کسی کو یہی نعرہ لگانا پڑیگا۔ اس لئے کہ یہ نعرہ اس امر کی نشان دہی کرتا ہے کہ ہمارے ملک میں غریبی کا گھیرا کتنا بڑا ہے۔ اسے قابو میں لانے کی ضرورت ہے۔ اس گھیرے کے دائرے کو بتدریج کم کرنیکی ضرورت ہے۔ اور یہ کام بتدریج ہی ہو سکتا ہے۔ یورپ کو اپنی غریبی ہٹانے میں چار سو سال لگے۔ امریکہ کو ایک سو سال۔ سویت روس نے پچاس سال لئے۔ کیونکہ سائنس اب بہت ترقی کر چکی ہے۔ اب ہندوستان جیسے کثیر الآباد ملک کی غریبی بھی تیس چالیس سال میں ہٹائی جا سکتی ہے۔ اگر سائنسی طریقوں کو ہی اپنایا جائے۔ پنج سالہ پلان۔!"

سونے کی انگوٹھی والا انسان جھلّا کر بولا ـــــ "اجی سب ہی پنج سالہ پلان فیل ہو چکے ہیں۔ شرح پیداوار کبھی تین فیصدی سے یا چار فیصدی سے زیادہ نہیں بڑھی۔ اس شرح سے ہر سال آبادی بڑھ جاتی ہے۔ نتیجہ صفر۔ ہاں اگر شرح پیداوار چھ فیصدی سے نو فیصدی بڑھ جائے۔!"

میں نے کہا ـــــ "جاپان میں شرح پیداوار دس فیصدی ہے۔ اس لئے بڑھتی ہوئی آبادی کے باوجود وہ ایک امیر ملک بن چکا ہے۔ ہم کو بھی اِس حساب سے ترقی کرنی ہوگی۔"

"سب باتیں ہی باتیں ہیں جناب۔ ہم لوگ کام چور ہیں۔ کسی کو دیش کی فکر نہیں۔ سب کو اپنا گھر بھرنے سے فرصت ملے تو کوئی دیش کا بھلا سوچے۔ بیکاری مہنگائی، خویش پروری، رشوت ستانی نے ہمارے سماج کی جڑیں قطعاً کھوکھلی کر دی ہیں۔ اب دیش کا بھگوان ہی مالک ہے۔"

شیروانی والے صاحب مسکرا کر بولے۔ "صاحب، اس طرح سوچنے سے کچھ نہ ہوگا۔ اتنی مایوسی بھی اچھی نہیں۔ ہاں کمر کس کے کام کرنے کی ضرورت ہے۔ آخر پچھلے پچیس برسوں میں ہم بالکل بیکار ہی نہیں بیٹھے رہے ہم نے اپنے ملک میں ایک صنعتی بنیاد قائم کرلی ہے۔ فولاد۔ تیل۔ موٹر۔ کھاد۔ اور کیمیکل دوائیاں بجلی الیکٹرانکس اور مشین بنانے کے کارخانے قائم کرلئے ہیں۔ یہ سوچئے کہ انگریزوں کے وقت میں اس ملک میں ایک سوئی بھی تیار نہیں ہوتی تھی۔ اب ایک بہت بڑا د (INDUSTRIAL BASE) تیار ہو چکا ہے۔ اس کو بھی ذہن میں رکھیئے اور ہمّت سے آگے بڑھنے کا سلیقہ لایئے۔"

"یہ آپ کون سا رسالہ پڑھ رہے ہیں۔"؟

"یہ اُردو کا ایک رسالہ ہے۔"

"مگر اُردو تو پاکستانی زبان ہے۔ اس کا اس دیش میں کیا کام۔؟"

"شیروانی والے آدمی کے چہرے پر ایک رنگ آیا ایک گیا۔ پھر اس نے اپنے آپ کو سنبھالنے کے لئے چاندی کی ڈبیہ کھولی۔ اس میں سے مگھئی پان کا ایک بیڑا منہ میں رکھا۔ بڑی متانت سے بولا۔

"صاحب، اُردو تو اسی دیش میں پیدا ہوئی۔ یہیں پلی بڑھی۔ اس کی تاریخ تین سو برس پرانی ہے۔ جب پاکستان کا کہیں وجود نہ تھا۔ اس زبان نے بڑے بڑے شاعر اور نثر نگار پیدا کئے ہیں۔ یہ ہماری سولہ قومی زبانوں میں سے ایک اچھی اور بڑی زبان ہے۔"

"مگر کیا آپ اس سے اِنکار کر سکتے ہیں کہ پاکستان نے اسے اپنی قومی زبان قرار دیا ہے اور یہ پاکستان میں کثرت سے بولی جاتی ہے۔"

"پاکستان نے اسے قومی زبان بنایا ہے۔ تو اس سے اُردو کی طاقت اور خوب صورتی کا ثبوت ملتا ہے۔ سری لنکا کے ایک حصّہ کی زبان تامل ہے تو یہ امر تامل کے خلاف کیوں جائے۔ اس دنیا میں آدمیوں نسلوں، قوموں جاتیوں، اور مذہبوں کی درآمد برآمد ہوتی رہتی ہے۔ اسی طرح زبان کی درآمد ہوتی رہتی ہے۔ اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ ہمیں تو خوش ہونا چاہیئے کہ ہمارے ملک کی ایک زبان اپنے ملک سے باہر بھی اس قدر پسند کی جاتی ہے۔"

"نہیں جناب، آپ بالکل غلط کہتے ہیں۔" انگوٹھی والا چلایا۔ "یہ پاکستان

کی زبان ہے، مسلمان کی زبان ہے۔ جب پاکستان بن گیا تو اس زبان کو بھی دیس نکالا دے دینا چاہیئے۔"

شیروانی والے آدمی نے اپنی شیروانی کے تین بٹن کھولے۔ چاندی کی ڈبیہ کو بند کر کے جیب میں رکھا۔ پیکدان اٹھا کر اس میں پیک گرائی۔ ان کاموں نے اس کا غصّہ ٹھنڈا کرنے میں اس کی بہت مدد کی یہ تو اب ظاہر تھا کہ سامنے والا آدمی اس سے جھگڑا کرنے پر تلا ہوا تھا۔ شیروانی والا آدمی اسے طرح دینا چاہتا تھا۔ مگر اس بحث میں اپنے مقام سے ہٹنے کے لئے بھی تیار نہ تھا۔ اس نے بڑی ہی سنجیدگی سے کہا۔

"صاحب، تازہ مردم شماری کے اعتبار سے اس ملک میں چھ کروڑ مسلمان ہیں۔ ان میں صرف ڈھائی کروڑ اُردو بولتے ہیں۔ اس لئے یہ سارے مسلمانوں کی زبان نہیں ہے۔ تازہ مردم شماری کے تحت اُردو بولنے والوں کی تعداد تین کروڑ ہے۔ اس لئے ڈھائی کروڑ مسلمانوں کے علاوہ آدھے کروڑ کے قریب ہندو، سکھ، عیسائی بھی یہ زبان بولتے ہیں۔ اس طرح سے بھی یہ صرف مسلمانوں کی زبان نہیں قرار دی جا سکتی۔ اسے سب کی سانجھی زبان سمجھنا پڑیگا۔ دراصل زبان کا کوئی مذہب نہیں ہے۔ ہندی، گجراتی، تامل، اڑیا، آسامی، بنگالی ان سب زبانوں کے بولنے والوں میں ہر فرقے اور ہر مذہب کے لوگ پائے جاتے ہیں۔ دنیا کی کسی بھی ایک زبان کو کسی ایک مذہب سے وابستہ نہیں کیا جا سکتا۔ اس لئے اس زبان کو دیش نکالا نہیں دیا جا سکتا۔ کیونکہ یہ زبان پاکستان سے یہاں نہیں آئی ہے۔ پاکستان والوں نے اسے یہاں سے امپورٹ کیا ہے۔ ہندوستان کے تین کروڑ آدمی اسے

اپنی مادری زبان سمجھتے ہیں۔

"ان تین کروڑ لوگوں میں جاہلوں اور اَن پڑھوں کی تعداد کتنی ہو گی۔؟"
انگوٹھی والے آدمی نے ایک طنزیہ ہنسی ہنس کر کہا۔

"یقیناً بہت زیادہ ہوگی۔ مگر اسے صرف اُردو تک کیوں محدود رکھیئے ___ ہندوستان میں اَن پڑھ لوگوں یا کم پڑھے لوگوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ اس لئے اُردو ہی نہیں ہر زبان میں اَن پڑھوں یا کم پڑھے لکھے لوگوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ اور یوں سوچا جائے تو پڑھے لکھوں کا تناسب ہر زبان میں ایک سا رہے گا۔ یعنی اگر تین کروڑ اُردو والوں میں صرف تین لاکھ پڑھے لکھے ہوں گے تو پندرہ کروڑ ہندی والوں میں پندرہ بیس لاکھ اعلیٰ پائے کے پڑھے لکھے بھی ضرور ہوں گے۔ یہی حال دوسری زبانوں کا ہوگا۔ اس لئے تناسب تو وہی رہے گا اور آپ کی دلیل بیکار ہو جائیگی۔"

"میری دلیل بیکار نہیں ہے۔ اس زبان کا رسم الخط امپورٹڈ ہے۔ فارسی رسم الخط ہے۔ آپ اگر زبان نہیں بدل سکتے تو اس کا رسم الخط بدل دیجئے۔ یہ غیر ہندوستانی رسم الخط ہے صاحب۔"

"بلاشبہ ہم نے اس کا رسم الخط فارسی سے لیا ہے۔ مگر اس میں ہم نے کئی تبدیلیاں بھی کی ہیں۔ اپنی ہندوستانی ضروریات کے مطابق اس میں بھ۔ پھ۔ تھ۔ ٹھ۔ جھ۔ چھ۔ دھ۔ ڈھ۔ کھ۔ گھ کی مختلف آوازیں اور ان کے مطابق حروف ڈھالے ہیں جو فارسی زبان میں نہیں ہیں۔ اس لئے اب اسے فارسی کا رسم الخط نہیں کہا۔ اسے اُردو کا رسم الخط کہنا چاہیئے۔ اب تو کشمیری زبان کا بھی

یہی رسم الخط ہے۔ اور اس سے ملتا جلتا سندھی زبان کا بھی یہی رسم الخط ہے۔
اس کے علاوہ ہمارے پاس گورمکھی کا رسم الخط ہے جو دیوناگری سے کئی اعتبار
سے مختلف ہے۔ بنگالی کا بھی کسی قدر مختلف ہے۔ پھر جنوبی ہندوستان کی
زبانوں کا رسم الخط ہے۔ تامل۔ ملیالی۔ کنڑی۔ تلگو زبانوں کا رسم الخط دیوناگری
سے بالکل مختلف ہے۔ اس لئے میں رسم الخط کی تبدیلی پر اصرار نہیں کرنا چاہتا
یہ تو اس ملک کے کلچر اور مزاج کی رنگا رنگی ہے جہاں بہت سی قومیں۔ بہت
سی نسلیں۔ بہت سی زبانیں۔ بہت سے مذاہب اور کلچر آباد ہیں۔ وہاں،
ایک سے زیادہ رسم الخط بھی ہیں اور میں تو اب ان سب کو ہی ہندوستانی
رسم الخط سمجھوں گا۔"

انگوٹھی والے حضرت بولے۔

"میرے خیال میں آپ مسلمان ہیں جبھی تو ایسی باتیں کر رہے ہیں۔"

شیروانی والے صاحب مسکرائے۔ انگوٹھی والے صاحب کی آنکھوں میں
آنکھیں ڈال کر بولے۔

"جناب، میرا نام شیام کشن نگم ہے۔ جناب خاکسار دہلی کا رہنے والا ہے۔"

پھر قدرے توقف کے بعد پوچھا۔

"آپ کی تعریف۔"

انگوٹھی والے صاحب کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ دیر تک ہنستے رہے۔
نگم صاحب کو اچنبھا ہوا۔

"کیا صاحب، میں نے آپ سے ایسا کون سا سوال کر دیا ہے جس پر

آپ کو اسقدر ہنسی آرہی ہے۔؟"

انگوٹھی والے صاحب بڑی مشکل سے اپنی ہنسی روک کر بولے "معاف کیجئے گا صاحب۔ میں آپ کو مسلمان سمجھا تھا۔ اس لئے اُردو کے مسئلہ پر آپ کو چڑانے کی کوشش کر کے اس بے لطف سفر میں کچھ دلچسپی پیدا کرنا چاہتا تھا۔ مگر آپ کی سنجیدگی، متانت اور بردباری سے پیش کی گئی دلیلوں نے میری اسکیم غارت کردی۔"

وہ پھر ہنسنے لگے۔

نگم صاحب بولے۔ "مگر آپ نے ابھی تک اپنا نام نہیں بتایا۔"

انگوٹھی والے صاحب بولے۔ "خاکسار کو ضیاءالدین برنی کہتے ہیں۔"

اب نگم صاحب اور برنی صاحب دونوں حضرات کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ مَیں جو اُن سے دور بیٹھا ہوا تھا۔ مگر ان کی بحث غور سے سُن رہا تھا۔ میں بھی مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔

نگم صاحب نے اپنی ڈبیہ کھول کر برنی صاحب کے آگے بڑھا دی۔ اور بولے۔

"لیجئے گلوری حاضر ہے۔"

یکایک گاڑی ایک جھٹکے سے رک گئی۔

ہم سب لوگ باہر دیکھنے لگے۔ کیا ماجرا ہے۔؟

مگر باہر اسقدر اندھیرا بڑھ چکا تھا کہ کچھ بھی نظر نہ آتا تھا۔

چند منٹ بعد باہر سے فائر کی آواز آئی۔ پھر دو ڈاکو رائفلیں اٹھائے

خاکی لباس پہنے ہمارے ڈبے میں داخل ہوئے۔
فائر کی آواز سنکر ریکھا ہڑبڑا کر جاگ اٹھی۔
ڈاکوؤں نے اندر آکر غور سے چاروں طرف دیکھا۔
ایک ڈاکو بولا۔ "ٹھاکر شیوچرن سنگھ کی بیوی کون ہے۔؟"
ریکھا بولی۔ "میں ہوں۔!"
"تو نیچے اترو۔" دوسرا ڈاکو بولا۔
ڈبے میں سناٹا چھا گیا۔ کوئی بھی کچھ نہ بولا۔
میں نے ڈاکوؤں سے کہا۔" جیرآباد اپنی سسرال جارہی ہے۔ یہ یہاں کیوں اترے گی۔؟"
"تم کون ہو۔؟"
میں نے کہا۔" میں اسے پہونچانے کے لئے جیرآباد تک جارہا ہوں۔"
"تو تم بھی نیچے اترو۔" ایک ڈاکو نے بڑی سختی سے مجھے اپنی رائفل سے ٹہوکا دیا۔
میں حیرت سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ مگر کوئی کچھ بول نہیں رہا تھا۔ اور کوئی کہتا بھی کیا۔؟ سب ہی نہتے تھے اس لئے سب ہی خاموش تھے۔
"اُترو ــــــ!" ایک ڈاکو نے ریکھا کو بازو سے پکڑ کر برتھ سے اٹھا دیا۔
ریکھا نے اس کا ہاتھ جھٹک کر کہا۔" ہاتھ چھوڑ دو، میں خود چلتی ہوں۔"
آگے آگے ریکھا اُترنے کے لئے دروازے تک جانے لگی۔ پیچھے پیچھے میں۔

ہم دونوں کے پیچھے وہ دونوں ڈاکو بھی اُتر گئے۔

اور جب ہم چاروں پٹری سے اتر کر کھیتوں کے قریب سے گزرنے والی ایک تاریک پگڈنڈی پر آگئے اور ڈاکوؤں کے بتائے ہوئے راستہ پر چلنے لگے۔ تو چند منٹ کے بعد گاڑی بھی چلنے لگی۔ تھوڑی دیر کے بعد سنّاٹا ہوگیا۔

●

○

گھٹاٹوپ اندھیرا تھا۔ ہم لوگ خاموشی سے چلے جا رہے تھے۔ آہستہ آہستہ میدانی راستہ ختم ہونے لگا اور چھوٹے چھوٹے ٹیلے اور ان کے پیچھے چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں نمودار ہونے لگیں جن کی نوکیلی لکیریں کسی آرے کے دانتوں کی طرح افق کے سینے میں چبھی ہوئی تھیں۔ اور کہیں کہیں اِکّا دُکّا درختوں کے کٹ آؤٹ جامد چوبداروں کی طرح یا اَدب باملاحظہ کھڑے نظر آنے لگے اور راستہ تنگ پگڈنڈی کی صورت میں کبھی ریتیلے ٹیلوں، کبھی چٹانوں، کبھی خاردار جھاڑیوں کے درمیان سانپ کی طرح بل کھاتے ہوئے گھومنے لگا۔

چلتے چلتے میں نے ریکھا کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اس کا ہاتھ بری طرح لرز رہا تھا۔ دھیرے دھیرے وہ خوف زدہ لرزش ختم ہو گئی اور میرے ہاتھ کی حدّت سے اس کا ہاتھ ملایم ہوتا گیا۔ نرم پڑتا گیا۔ اور آخر میں موم کی طرح کسی گہرے جذبے میں پگھل گیا۔ مجھے ایسا لگا جیسے میرے اور اس کے ہاتھ میں صدیوں پرانے جذبوں کا سنگم ہے۔

جو ہر عہد میں آکر نئے ہو جاتے ہیں۔!

دو ڈاکو آگے چل رہے تھے۔ پندرہ بیس قدم کے فاصلہ پر دو ڈاکو ہمارے پیچھے آرہے تھے۔ کوئی پچاس گز کا فاصلہ رکھ کر۔ آگے پیچھے جدھر بھی دیکھو دو موہوم سائے گہری تاریکی میں اور زیادہ گہرے دھبّوں کی طرح نظر آتے تھے۔

میں نے چلتے چلتے ریکھا کے کان میں کہا۔ "آگے چل کر جہاں میں مناسب سمجھوں گا تمہارا ہاتھ زور سے دبا دوں گا۔ تم تیزی سے میرے ساتھ ساتھ چلی آنا۔"

ریکھا نے ہوا سے بھی مدھم سرگوشی میں کہا۔ "وہ لوگ ہمارے آگے پیچھے دونوں طرف چل رہے ہیں۔"

میں نے کہا ——— "آگے اور پیچھے ضرور ہیں۔ دائیں اور بائیں نہیں ہیں اور راستہ پہاڑی ہوتا جا رہا ہے۔ اور کبھی کبھی موڑ پر ہمارے آگے پیچھے چلنے والے منظر نہیں آئیں گے۔ بس وہ موقع ہو گا۔"

ریکھا چپ ہو گئی۔ ہم دونوں خاموشی سے چلتے گئے۔ کوئی آدھے گھنٹے کے بعد باقاعدہ پہاڑی راستہ شروع ہو گیا اور جنگل گھنا ہوتا گیا۔ میری آنکھیں آہستہ آہستہ اندھیرے کی عادی ہو گئی تھیں۔ اور میں ہر لحظہ موقعے کی تلاش میں تھا۔ مگر پہاڑی راستہ شروع ہوتے ہی چاروں ڈاکوؤں نے اپنا فاصلہ دونوں طرف سے کم کر دیا تھا اور ہمیں ہر وقت منظر میں رکھنے کی کوشش کرتے تھے۔ کچھ ہمیں اس راستہ سے اجنبی سمجھ کر اور اس علاقہ کو بالکل اپنا سمجھ کر ضرورت سے زیادہ خود اعتماد تھے۔

بالآخر اُن کی یہی حد سے بڑھی ہوئی خود اعتمادی ہمارے کام آئی۔ ایک ایسا تیز کٹاؤ والا موڑ سامنے آیا جہاں پر آگے اور پیچھے دونوں طرف سے آنیوالے ڈاکو اس موڑ کے دونوں طرف سے اوجھل ہو گئے تھے۔ مگر یوں صرف چند لمحوں کیلئے رہیگا۔ اور صرف اگلے چند لمحوں میں مجھے فیصلہ کر لینا ہوگا۔ موڑ کے اوپر کی چڑھائی عمودی معلوم ہوتی تھی۔ اسے جلدی سے طے نہیں کیا جا سکتا تھا۔ نیچے ڈھلان تھی ممکن ہے گہری کھڈ ہو۔ کتنی گہری اس کا اندازہ رات کے اس گہرے اندھیرے میں نہیں ہو سکتا تھا۔

میں نے جلدی سے ریکھا کا ہاتھ دبایا۔ ریکھا ایکدم چوکنّی ہو گئی۔ ہم دونوں بائیں کونے سے نیچے کھڈ میں کود گئے۔

پہلے چند ثانئے تک ایسا لگا جیسے ہوا میں ہم معلّق ہیں۔ پھر خوش قسمتی سے ہم دونوں زمین پر بچھی ہوئی دبیز پتوں والی ایک گھنی جھاڑی میں جا گرے ایک خرگوش جو اس جھاڑی میں چھپا بیٹھا تھا۔ گھبرا کر کان کھڑے کر کے جنگل کے اندر بھاگا۔ میں نے ریکھا کا ہاتھ پکڑا اور اسے لے کر جنگل کے اندر گھس گیا۔

اب ہمارے پیچھے پیچھے آوازیں آرہی تھیں۔ شور بڑھ رہا تھا۔ ہم اس شور اور اپنے درمیان زیادہ سے زیادہ فاصلہ بڑھا دینا چاہتے تھے۔ اس لئے تقریباً دوڑنے کی رفتار سے جنگل کے اندر گھس رہے تھے۔ پھر پیچھے پگڈنڈی پر روشنی نظر آنے لگی اور اس کی لرزتی ہوئی چمک درختوں کے پتوں اور تنوں پر پڑنے لگی۔

اتنے میں شاید ڈاکوؤں نے معلوم کر لیا تھا کہ ہم لوگ موڑ کے اوپر نہیں

بھاگے تھے بلکہ نیچے کی طرف ڈھلان پر کود گئے تھے۔ اب انہوں نے بھی ہمارے تلاش کرنے کے لئے یہی راستہ اختیار کر لیا تھا۔ مگر اب ہمارے اور ان کے درمیان ایک ڈیڑھ منٹ کا فاصلہ تو تھا ہی۔

پھر بھی میں نے اندازہ لگایا۔ ہمارے لئے یہ جنگل نیا ہے۔ اور ان کیلئے برسوں کا دیکھا ہوا۔ وہ بہت جلد ہمیں آلیں گے۔ کیا کرنا چاہیئے۔ دماغ بہت تیزی سے کام کر رہا تھا۔ آگے پیچھے دیکھ کر میں نے پیڑوں کے ایک گھنے جھنڈ کا انتخاب کیا اور سرگوشی میں ریکھا سے پوچھا۔

"کیا تم درخت پر چڑھ سکتی ہو۔؟"

ریکھا نے دھیرے سے کہا۔ "ہاں۔!"

"تو اس درخت پر چڑھ جاؤ۔" میں نے ایک گھنے پیڑ کی طرف اشارہ کیا۔ وہ ایک بلّی کی طرح اس درخت پر چڑھ گئی۔ اور اوپر کی گھنی شاخوں میں غائب ہو گئی۔

چند لمحوں کے بعد میں بھی اسی پیڑ پر چڑھنے لگا۔ بازو بھی چھلے اور ٹانگیں بھی۔ کیونکہ درختوں پر چڑھنے کا عادی نہ تھا۔ پھر بھی کوشش کر کے اور شور نہ پیدا کر کے خاموشی سے اس پیڑ پر چڑھنے میں کامیاب ہو گیا۔ اور ریکھا کے قریب ہی ایک شاخ پر جا بیٹھا۔ دل بری طرح دھک دھک کر رہا تھا۔ اور سانس بھی بہت بری طرح پھول گیا تھا۔

بس یوں سمجھئے کہ مشکل سے آدھے منٹ کا فرق رہا ہوگا۔ اتنے میں ڈاکو اس کنج کے آس پاس روشنی پھیلاتے ہوئے آگے گزر گئے مگر یہ جھنڈ اسقدر گھرا

تھا اور ہم اتفاق سے اتنے گھرے پتّوں میں چھپے ہوئے تھے کہ ان کی روشنی ہم پر نہ پڑ سکی۔ چند منٹ وہ اِدھر اُدھر دیکھتے رہے۔ پھر آگے چلے گئے۔ چند لمحوں کے بعد جنگل میں سنّاٹا چھا گیا۔ اور جھلملاتی روشنیوں کے گم ہو جانے کے بعد تاریکی اور گہری ہوتی گئی۔

"بچ گئے ——! " ریکھا نے اِطمینان کا سانس لیا۔

"بچ تو گئے مگر اس اندھیرے میں جائیں گے کہاں۔ ؟ راستہ تک تو ہمیں معلوم نہیں۔"

ریکھا بولی۔ "جس راستہ سے آئے تھے اسی راستہ سے واپس چلے جائیں گے۔"

میں نے کہا۔ "ڈاکو ایسے بیوقوف نہیں ہیں۔ انہوں نے کسی ایک ساتھی کو ضرور پیچھے بھیجا ہوگا۔"

ریکھا بولی۔ "تو رات بھر اسی پیڑ پر بیٹھے رہیں گے۔ صبح نیچے اتر کر راستہ تلاش کرینگے۔"

میں نے کہا۔ "صبح ان لوگوں کو بھی ہمیں ڈھونڈھنے میں آسانی ہوگی۔"

ریکھا چپ ہوگئی

قدرے توقف کے بعد بولی۔ "تو تم کیا چاہتے ہو۔ ؟"

ہم دونوں دو قریب کی شاخوں پر بیٹھے بہت دھیرے دھیرے باتیں کر رہے تھے۔ اس کا سوال سنکر میں نے سوچ سوچ کر کہا۔

" ابھی تو میں یہ سوچ رہا ہوں کہ ان لوگوں کو کیسے پتہ چلا کہ ہم دونوں اِس گاڑی سے سفر کر رہے ہیں۔ ؟ اِن لوگوں کو بتانے والا کون تھا۔ ؟"

ریکھا بولی ــــــ "ہو نہ ہو یہ ساری کارستانی ان دونوں کارندوں کی ہے۔ ممکن ہے ان کا کوئی مخبر شپارا کی سرائے میں بیٹھا ہو اور اس نے ہمیں دیکھ لیا ہو اور اس نے ہمارا پیچھا کیا ہو۔ اور اسی نے ممکن ہے ڈاکوؤں کو بتا دیا ہو، ورنہ کون ہو سکتا ہے۔؟"

"مگر ایسا انہوں نے کیوں کیا۔؟"

"ہو سکتا ہے راوت آزاد ہو چکا ہو۔ ہو سکتا ہے راوت کے کہنے پر ایسا کیا گیا ہو۔ ہو سکتا ہے۔ راوت ابھی تک قید میں ہو مگر اس کی نظر بندی اِن کارندوں کو بُری لگی ہو۔ اور انہوں نے انتقام لینے کے لئے ایسا کیا ہو۔"

میں سوچتا رہا۔ ریکھا کی دلیل میں وزن تھا۔ اس کے علاوہ اور کوئی بھی معقول وجہ مجھے بھی نہیں سوجھی۔ مگر جو کچھ بھی ہو معاملہ بہت ہی پیچیدہ ہے۔ پیچھے وہاں سربھنی کی وادی میں کیا ہو رہا تھا۔؟ عجیب سے وسوسے میرے دل میں اٹھنے لگے۔ شائد ہم دونوں کو اتنی جلدی وہاں سے نہیں آنا چاہیئے تھا۔ سرو جا دیوی خطرے میں تھی۔

جب میں نے ریکھا سے اپنے وسوں کا اظہار کیا تو وہ گہری اُداسی سے بولی۔

"تم چاہتے تو وہیں رہ سکتے تھے مگر میرے لئے مزید رکنا ممکن نہیں تھا۔ تم میرے خاوند کو نہیں جانتے۔ اس نے مجھے واپس آنے کی جو تاریخ دے رکھی تھی۔ اس تاریخ کو میرا واپس پہونچنا ضروری تھا۔ ورنہ وہ میری کھال اُدھیڑ دیتا۔"

میں نے کہا۔" اس میں رکھا بھی کیا ہے۔ کھال ہی تو وہ ادھیڑتا ہے تمہاری۔ اور کرتا کیا ہے۔ ؟"

ایک کھڑکا سا ہوا۔ کوئی جنگلی جانور نیچے جھاڑیوں سے گزرتا ہوا بھاگا۔ پھر خاموشی۔ پھر اس خاموشی میں یکایک کسی گھونسلے میں کسی پرندے کے پَر پھڑپھڑانے کی آواز۔ دُور کہیں کوئی گیدڑ بولا۔ پھر اس کے ساتھ دو چار اور گیدڑ، مخالف سمت سے آوازیں دینے لگے۔ پھر سنّاٹا چھا گیا۔

اس سنّاٹے میں جھاڑیوں میں چھُپے بنیڈوں کی آواز تیز ہو گئی۔ مگر اس آواز کا رِدم خاموشی کا ایک حصّہ معلوم ہوتا تھا۔ جیسے خاموشی اس آواز کی لَے پر دھیرے دھیرے سانس لے رہی ہو۔!

سوچ سوچ کر میں نے ریکھا سے کہا۔" دن چڑھنے سے پہلے ہمیں واپس شپارا پہونچ جانا چاہیئے۔ یہ علاقہ ڈاکوؤں کا ہے۔ اس لئے میں سمجھتا ہوں کہ دن کی روشنی کے بجائے رات کے اندھیرے میں طے کرلینا چاہیئے ورنہ دن کی روشنی میں ہم پکڑے جائیں گے۔"

ریکھا بولی۔" سب سے اچھّی بات یہ ہوتی اگر تمہیں جیر آباد جانے کا راستہ معلوم ہوتا۔ اونٹوں کا راستہ تو مجھے معلوم ہے مگر اس وقت ہم کہاں ہیں مجھے کچھ نہیں معلوم۔"

" تو پھر تو یہی بہتر ہے کہ واپس شپارا چلا جائے۔ دھیرے دھیرے دیکھتے ہوئے سنبھل سنبھل کر جائیں گے ریکھا۔"

" جیسی تمہاری مرضی۔"

"تو پھر نیچے اترو۔ واپس جانے کا ڈھنگ سوچتے ہیں۔"
ریکھا احتیاط سے نیچے اترنے لگی۔ نیچے جاکر دھم سے پتوں پر اُترنے کی آواز آئی۔
پھر میں اس کے پیچھے پیچھے اُترا۔
نیچے اتر کر کیا دیکھتا ہوں کہ ایک ڈاکو ریکھا کے منہ پر ہاتھ رکھے اس کے دونوں بازوؤں کو اپنے ایک ہاتھ میں جکڑے کھڑا ہے اور ریکھا جدوجہد کر رہی ہے۔
جب میں اترا تو اسی لمحہ دوسرے ڈاکو نے رائفل کی نال میرے سینے پر رکھ دی۔

●

○

اس کے خشونت آمیز چہرے پر گھنی بھنویں تھیں اور ان کے نیچے لال لال ڈورے والی آنکھیں، تنگ پیشانی، موٹے ہونٹ اور مضبوط فراخ سینہ۔ اور کانوں سے نیچے رخساروں تک پھیلے ہوئے بڑے بڑے گل مچھے اور اسی کی طرح بٹی ہوئی گھنی مونچھ۔ وہ سر سے پیر تک پیشہ ور ڈاکو دکھائی دیتا تھا۔ اس کے جسم کو دیکھ کر لگتا تھا کہ پانچ آدمیوں کی طاقت اس اکیلے جسم میں ہے۔ دائیں بائیں اس کے دو لفٹننٹ تھے۔ اور وہ اس سے زیادہ ظالم اور تیز مزاج کے معلوم ہوتے تھے۔!

اس نے مجھ سے کہا ـــــ "مجھے تم میں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ تم سے کوئی جھگڑا نہیں ہے، تم جا سکتے ہو۔"

میں نے کہا۔ "میں اس لڑکی کو اکیلا چھوڑ کر نہیں جاؤں گا۔"

وہ بولا ـــــ "یہ لڑکی بیاہتا ہے۔ جیر آباد کے ٹھاکر شیو چرن سنگھ سے

بیاہی ہے۔ ٹھاکر اس کو چھڑا سکتا ہے. تم اس کے پاس میرا سندیسہ لیکر جا سکتے ہو۔"

"کیسا سندیسہ۔؟" میں نے پوچھا۔

"مجھے پچیس ہزار روپے چاہئیں۔ ان روپوں کے عوض میں اسے آزاد کر سکتا ہوں. تم میرا سندیسہ لے کر جا سکتے ہو۔"

میں نے کہا۔ "مجھے جیر آباد کا راستہ معلوم نہیں ہے۔"

وہ بولا۔ "میرا ایک آدمی تمہارے ساتھ جائے گا۔"

میں نے کہا۔ "ممکن ہے ٹھاکر میری بات کا بھروسہ نہ کرے۔"

وہ بولا ــــــ "اسے کرنا ہوگا۔ وہ تمہارے ساتھ بے ہتھیار یہاں تک آسکتا ہے. پچیس ہزار روپے دیکر وہ اپنی بیوی کو چھڑا کر لے جا سکتا ہے۔ ان دونوں کو کوئی تکلیف پہونچائے بغیر جیر آباد تک جانے دیا جائے گا۔ اور تم چاہو تو آج ہی واپس جا سکتے ہو۔ اس معاملہ میں مت پڑو۔ میں خود ٹھاکر کو اطلاع کر دوں گا۔"

میں نے ریکھا کی طرف دیکھا۔ ریکھا کی آنکھوں میں ایک پل کے لئے بجلی سی چمکی، پھر بجھ گئی۔ اس نے آنکھیں جھکا لیں مگر اس کی سانس تیز تیز چل رہی تھی۔ اور لگتا تھا کہ وہ بہت مضطرب ہے۔

میں نے اس سے کہا۔ "میں اکیلے میں ریکھا سے بات کرنا چاہتا ہوں۔"

"کرلو۔" وہ بڑی نرمی سے بولا۔ "میں آدھے گھنٹہ بعد آجاؤں گا۔"

اتنا کہہ کر وہ غار سے باہر چلا گیا. مگر مجھے معلوم تھا کہ باہر نکلنے کی ہر کوشش بے کار ہوگی. غار کے باہر کڑا پہرا تھا اور ہمارے فرار کی پہلی کوشش کے بعد وہ لوگ

ہم پر ایک منٹ کے لئے بھی بھروسہ نہیں کریں گے۔

جب وہ تینوں ڈاکو باہر چلے گئے تو میں نے ریکھا سے پوچھنا چاہا مگر میرے پوچھنے سے پہلے وہ بڑی سختی سے سر ہلا کر بولی۔

"تمہارا جانا بیکار ہوگا۔ میرا پتی میرے لئے ایک پیسہ بھی خرچ نہیں کریگا۔"

"کیوں نہیں کریگا۔؟"

وہ دیر تک خاموش رہی پھر جھجک کر بولی۔" ایک اور عورت ہے۔"

"کیوں نہیں کر

"کیا معلوم چابک کھاتی ہے یا مارتی ہے مگر ایک خونخوار ڈٹنی ہے۔ اور میرا پتی اس کے پنجے میں ہے۔ وہ ڈٹنی اس موقعے کو غنیمت جانے گی۔"

"کوشش کر کے دیکھنے میں کیا حرج ہے۔"

"کوشش بے کار ہوگی۔" ریکھا گہری افسردگی سے بولی۔" وہ مجھ پر ایک دھیلہ بھی خرچ نہیں کریگا۔ الٹا تم پر شبہ کریگا۔ میں اپنے پتی کو جانتی ہوں۔"

"پھر بھی اس کے ساتھ رہتی ہو۔"

"مجبوری ہے مگر ان باتوں کا اس وقت ذکر کرنے سے کیا فائدہ۔؟ اب سب کچھ ختم ہے۔" وہ سسکی لینے لگی۔

"کچھ ختم نہیں ہے۔" میں نے اسے ڈھارس دیتے ہوئے کہا۔" میں تمہاری اماں کے پاس جا سکتا ہوں۔"

وہ بولی ——— "میری اماں کے پاس اب کیا رکھا ہے۔ ایک پرانی حویلی ہے اور زمین۔ تھوڑے سے زیور۔ گھر میں مشکل سے تین چار ہزار روپئے ہوں گے

اس کے پاس۔"

"پچیس ہزار روپے کہاں سے آئیں گے۔؟ نہیں نہیں اب کچھ نہیں ہو سکتا۔"

وہ ہاتھ ملتے ہوئے پھر بولی۔

میں نے کہا۔" حویلی بیچی جا سکتی ہے۔ زیور بیچے جا سکتے ہیں۔ زمینیں ہیں وہ بھی فروخت کی جا سکتی ہیں۔ کیا ماں اپنی بیٹی کے لئے اتنا بھی نہیں کریگی۔؟"

ریکھا بولی۔ زیور بیشک بیچے جا سکتے ہیں۔ انہیں شپارا کا کوئی بھی ساہوکار خرید لے گا۔ مگر وہ بھی مشکل سے تین چار ہزار کے ہوں گے۔ رہ گئی حویلی تو جنگل میں کھڑی حویلی کون خریدے گا۔ وہی خریگا جو زمین خریدنا چاہے گا۔ مگر اس کا گاہک۔؟" وہ یکایک چپ ہو گئی۔

میں نے کہا۔" اگر تمہارا پتی یہ رقم نہیں بھریگا اور تمہاری ماں بھی نہیں بھر سکتی تو میں یہ رقم بھر دوں گا۔"

"تم کہاں سے بھرو گے۔؟"

"میرے سوٹ کیس میں جو شپارا اسٹیشن پر پڑا ہے، تیس ہزار روپے بند ہیں۔ وہی رقم میں فارم خریدنے کے لئے لایا تھا۔ وہی رقم میں یہاں بھر دوں گا۔"

"تم ایسا کرو گے۔؟" ریکھا کی آواز بھر آگئی۔

"ہاں۔!"

"تم ایسا کیوں کرو گے۔؟" ریکھا کی آنکھیں ڈبڈبانے لگیں۔ وہ بڑی ہی کمزور آواز میں بولی۔

میں نے بڑی حسرت ناک نگاہوں سے اسے دیکھا۔ اس نے بھی بڑی گہری نظروں سے مجھے ایک پل کے لئے دیکھا ____ دوسرے لمحہ میں اس کی پلکیں رخساروں پر گر گئیں۔

پھر بہت دیر تک ہم دونوں میں سے کوئی نہیں بولا۔

ریکھا نے میری طرف دیکھتے ہوئے زمین پر نگاہیں ڈالتے ہوئے اور اپنے پاؤں کے انگوٹھے سے مٹی کریدتے ہوئے کہا۔

" مگر میں تمہارے لئے کچھ نہیں کر سکتی۔ کچھ نہیں کر سکتی۔"

" مجھے معلوم ہے۔" میں نے آہستہ سے کہا۔

" پھر بھی تم۔" وہ گھٹ کر رہ گئی۔ فقرہ بھی مکمل نہیں کر پائی۔

" ہاں پھر بھی میں وہی کروں گا جو اس وقت تم سے کہہ رہا ہوں۔"

وہ چپ ہو گئی۔ دیر تک انگوٹھے سے مٹی کریدتی رہی۔ جیسے انجانے جذبوں کے ڈھیر میں کسی روشن انگارے کو ڈھونڈ رہی ہو مگر منہ سے کچھ نہیں بولی۔

کچھ دیر کے بعد وہ تینوں ڈاکو غار میں آ گئے۔

بڑے ڈاکو نے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔

میں نے کہا۔" میرے ساتھ کسی کو جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں اکیلا ہی کافی ہوں۔ راستہ میں نے اس لڑکی سے پوچھ لیا ہے۔ میں اس کے پتی سے پچیس ہزار روپئے لے کر آتا ہوں۔"

" ٹھیک ہے۔" بڑا ڈاکو سر ہلا کر بولا۔" تم چاہو تو آج ہی رخصت ہو سکتے ہو۔ میں ٹھیک سات دن تک تمہارا انتظار کرونگا۔ اور یہ لڑکی ہمارے پاس رہیگی۔"

"مگر اس کا کیا بھروسہ ہے کہ اس کی عزت محفوظ رہے گی۔" میں نے بالکل بے دھڑک اس سے پوچھا۔

"یہ ڈاکو شان سنگھ کا وچن ہے۔" بڑا ڈاکو چھاتی پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ "اسکی جان محفوظ نہیں ہے۔ مگر اس کی عزت محفوظ رہے گی۔"

"کیا مطلب۔؟" میں پریشان ہوکر بولا۔ "جان محفوظ نہ ہونیکا مطلب۔؟"

"مطلب یہ ہے۔" ڈاکو شان سنگھ مجھے سمجھانے لگا۔ "اگر تم سات دن کے اندر اندر رقم لے کر واپس نہ آئے تو میں بس سات دن تک تمہاری راہ دیکھوں گا۔ اس کے بعد اس لڑکی کو گولی مار دوں گا۔"

"نہیں، نہیں۔ تم ایسا نہیں کر سکتے۔" میں نے گھبرا کر کہا۔

شان سنگھ ہنس کر بولا۔ "اگر ہم ایسا نہ کریں تو کوئی ہمیں ایک پیسہ بھی نہ دے۔ ہمیں اپنے پیشے کا پابند ہونا پڑتا ہے۔"

میں کچھ کہنے ہی والا تھا کہ یکایک ایک آدمی غار کے اندر آیا۔ اسے داخل ہوتے دیکھ کر میں چونک گیا۔

یہ رونق سنگھ تھا۔

داڑھی بڑھی ہوئی۔ ڈاکوؤں کے سے خاکی کپڑے مگر میلے اور سلوٹوں سے بھرے ہوئے۔ چہرے پر اضطراب اور پریشانی۔ اس نے میری طرف دیکھا نہیں۔ وہ اس قدر اپنے آپ میں کھویا ہوا تھا کہ شاید وہ اس دنیا ہی میں موجود نہ تھا۔

"کیوں۔؟" شان سنگھ نے اس سے پوچھا۔ "تمہاری بات چیت کا کیا

نتیجہ نکلا ۔ ؟"

" لڑکا تو مانتا ہے مگر ساوتری نہیں مانتی ۔"

" تو پھر ۔ ؟"

" تو پھر جیسا آپ کہیں ۔ ؟"

" میں کیا کہوں ۔ ؟" شان سنگھ بولا ۔" تم نے مجھ سے مدد مانگی ۔ میں نے ان دونوں کو ڈھونڈھ نکالا ۔ اور تمہارے حوالے کر دیا ۔ اب ان دونوں کی زندگی کے تم مالک ہو ۔ جیسا چاہو کرو ۔"

" دونوں جان سے جائیں گے ۔" یکایک رونق سنگھ بپھر کر بولا ۔

پھر اس کی نظر مجھ پر پڑی ۔ پھر ریکھا پر ۔ ایک دم بھونچکا سا رہ گیا ۔ اس کے منہ سے نکلا ۔ " ارے ۔"

میں نے کہا ۔ " تسلّی رکھو ــــــــ یہ لڑکی تمہاری ساوتری نہیں ہے ۔ یہ ریکھا ہے ۔"

رونق سنگھ بولا ۔" اگر میں ابھی ساوتری سے بات کر کے نہ آ رہا ہوتا تو مجھے پورا یقین ہو جاتا کہ یہ لڑکی ساوتری ہے ۔"

" ہاں ۔" میں نے کہا ۔" پہلے پہل مجھے بھی دھوکا ہوا تھا ۔"

" مگر کس قدر ان دونوں کی صورتیں ملتی ہیں ۔"

" مگر یہ مشابہت سطحی ہے ۔" میں نے کہا ۔

شان سنگھ نے رونق سنگھ سے پوچھا ۔" تم نے کیا فیصلہ کیا ۔ ؟"

رونق سنگھ بولا ۔" لڑکے کو باہر ایک پیڑ سے باندھ دیا ہے ۔ ساوتری کے

سامنے اسے گولی مار دونگا۔"

"چلو دیکھتے ہیں۔" مجھ سے شان سنگھ نے کہا۔ "تم بھی چلو تاکہ تمہیں بھی یقین ہو جائے۔ جو ہم کہتے ہیں وہ کر گزرتے ہیں۔"

غار کے جنوب میں تھوڑا سا ہموار علاقہ تھا۔ چھدرے چھدرے ڈھاک کے پیڑ تھے۔ ایک پیڑ سے میں نے ایک نوجوان کو بندھے دیکھا۔ اونچی کھڑی گردن پر فراخ پیشانی والا چہرہ۔ رنگت سرخ و سپید۔ بالوں میں سنہرے پن کی جھلک۔ ہاتھ پاؤں صاف ستھرے مگر شہری لڑکا نہیں معلوم ہوتا تھا۔ گاؤں والوں کی سی معصومیت اس کے چہرے پر تھی اور آنکھوں میں محبت کا غرور۔

رونق سنگھ نے کہا۔ "ساوتری کو بلواؤ۔"

مگر اس سے پہلے ہی دو ڈاکو ساوتری کو پکڑے چلے آرہے تھے۔ ساوتری کا چہرہ فق تھا۔ اور نگاہیں دھواں دھواں۔ وہ نگاہیں کسی ایک جگہ نہیں پڑتی تھیں۔

پیڑ سے بندھے نوجوان کے چہرے پر پٹی بندھی تھی۔

رونق سنگھ نے رائفل سیدھی کی اور بولا۔ "درشن سنگھ اپنے بھگوان کو یاد کر لو۔"

درشن سنگھ بولا۔ "رائفل چلاؤ زیادہ باتیں مت بناؤ۔"

رونق سنگھ نے کہا۔ "اگر تم ساوتری سے دست بردار ہوتے ہو تو میں تمہاری جان بخش سکتا ہوں۔"

درشن سنگھ کہنے لگا۔ "میں ساوتری سے دست بردار ہو سکتا ہوں۔ مگر اس کی

محبت سے نہیں۔ وہ تو آخری دم تک میرے دل میں رہے گی۔"

رونق سنگھ نے دانت پیس کر رائفل سیدھی کر کے نشانہ باندھ کے کہا۔

"تو مرنے کے لئے تیار ہو جاؤ۔"

یکایک ساوتری ایک ڈاکو سے ہاتھ چھڑا کر بھاگی اور دوڑتی ہوئی پیڑ سے بندھے نوجوان کے سینے سے لگ گئی۔ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

رونق سنگھ نے گرج کر کہا۔ "ساوتری سامنے سے ہٹ جاؤ۔"

وہ تو اور بھی زور سے اس نوجوان سے چمٹ گئی۔ شرربار نگاہوں سے رونق سنگھ کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

"مارنا ہے تو ہم دونوں کو اکٹھے ہی مار ڈال۔ چلا گولی۔"

رونق سنگھ کی شست بندھی رہی۔

کئی لمحے گزر گئے۔

"چلا گولی دیکھتا کیا ہے۔؟" ساوتری چلا کر بولی۔

رونق سنگھ نے بڑے ٹھہرے ہوئے لہجہ میں کہا۔ "اگر تم دونوں ایک دوسرے کو چھوڑ دوگے تو میں تم دونوں کی جان بخش دونگا۔"

"ایسے جینے سے موت اچھی ہے۔ چلا گولی۔" ساوتری کے لہجہ میں بڑی حقارت اور تلخی تھی۔

"آخری دفعہ تم سے پوچھتا ہوں۔ کیا تم اس لڑکے کو چھوڑ کر مجھ سے شادی کروگی۔"

"کبھی نہیں۔" ساوتری نے گہری شدت سے کہا۔

ہم دونوں سانس روکے یہ تماشہ دیکھ رہے تھے۔ رونق سنگھ کے چہرے پر پسینے کی بوندیں نمودار ہو چکی تھیں۔ ایسا لگتا تھا۔ جیسے اس کے اندر کوئی لڑائی چل رہی ہے۔ یکایک اس کے ہونٹ بھینچ گئے اور جبڑا تن گیا۔ گلوگیر لہجہ میں بولا۔

"تو پھر دونوں مرنے کے لئے تیّار ہو جاؤ۔"

"بس مرنے سے پہلے ایک بات پوری کر دو۔" نوجوان نے کہا۔

"کیا ہے۔؟"

"میری آنکھوں سے پٹی اتار دو۔"

"پٹی اتارنے سے تمہارا کیا بھلا ہو گا۔؟" رونق سنگھ نے اس سے پوچھا۔

"میں اپنی ساوتری کو آخری دم تک دیکھ سکوں گا۔"

"چپ رہو بدمعاش۔" رونق سنگھ نے گرج کر کہا۔

دھیرے دھیرے اس نے رائفل اونچی کی۔ ساوتری بالکل درشن سنگھ کے آگے آ چکی تھی۔

شان سنگھ نے ہنس کر کہا۔ "آج تمہارا امتحان ہے رونق۔ ایسا نشانہ باندھو کہ گولی اس لڑکی کے سینے سے نکل کر لڑکے کے سینے سے پار ہو جائے۔ ایک ہی گولی دونوں کی جان لے لے۔"

رونق نے ٹھیک سے رائفل برابر سطح پر اٹھا کر نشانہ باندھا۔ اس کا سارا چہرہ پسینے میں ڈوب چکا تھا۔ ہونٹ کانپ رہے تھے۔

شان سنگھ بولا۔

"ایک ـــــ

دو ــــــ

تین ــــــ

چار ــــــ!"

مگر گولی نہیں چلی۔ دھیرے دھیرے رائفل نیچے آتی گئی۔ اس کے پاؤں پر گر گئی۔ رونق سنگھ نے مڑ کر گلوگیر لہجہ میں کہا۔

"شان سنگھ ان دونوں کو جانے دو۔"

یکایک رونق سنگھ اپنی رائفل اٹھا کر اسے گلے سے لگا کر رونے لگا۔ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ جیسے ساری دنیا میں اس رائفل کے سوا اس کا اور کوئی رشتہ دار، ساتھی، سمبندھی نہ رہ گیا ہو۔

٭ ٭ ٭

"تم نے ان دونوں کو مارا کیوں نہیں۔؟"

اب ہم دونوں ڈاکوؤں کے علاقہ سے نکل کر شپارا کی طرف جا رہے تھے۔ ریل کی پٹری کے کنارے کنارے میں اور رونق سنگھ۔

رونق سنگھ دیر تک چپ رہا۔ پھر بولا۔ "کچھ تصویروں نے میرا ہاتھ روک دیا۔

"وہ کون سی تصویریں تھیں۔؟"

"بڑی بڑی آنکھیں کاجل لگاتی ہوئی۔ میلے کے سٹال پر کسی کے سڈول

ہاتھ، چوڑیاں پہنتے ہوئے۔ وہ آئینوں والا سرخ لہنگا۔ ہوا میں اڑتا ہوا اور کسی بیباک پرندے کی طرح وہ ہنسی ہوا میں اڑتی ہوئی۔ عجیب سی تصویریں تھیں۔ جب بھی میں شست باندھتا وہ تصویریں میرے سامنے آجاتیں۔ ان تصویروں نے مجھے ہرا دیا تھا۔"

رونق سنگھ نے رائفل سے ایک پتھر کو ٹھوکا دیا۔ پھر چپ ہو گیا۔

"مگر تم شان سنگھ کے پاس پہونچے کیسے۔؟"

"شان سنگھ میرا بچپن کا دوست ہے۔ ہم دونوں آٹھ جماعت تک اکٹھے پڑھے ہیں۔ پھر بڑا ہو کر میں فوج میں بھرتی ہو گیا۔ شان سنگھ ڈاکو بن گیا۔ میں غصہ میں تو بھرا ہوا تھا۔ اپنے گاؤں سے آ کر سیدھے اپنے دوست کے پاس گیا اس سے کہا۔" میں ڈاکو بننا چاہتا ہوں۔ وہ بولا کیوں۔؟ میں نے اسے پوری بات بتا دی وہ بولا۔

"ہمارے یہاں جو آدمی گینگ میں داخل ہوتا ہے۔ اسے ایک خون کرنا پڑتا ہے۔" میں بولا۔ میں ایک خون نہیں دو خون کرنے پر تیار ہوں۔"

شان سنگھ نے پوچھا۔ "دو خون کیسے۔؟"

میں نے کہا۔" اگر تم ساوتری اور اس کے ساتھ بھاگے ہوئے درشن سنگھ کو ڈھونڈ دو گے، تو میں تمہارے سامنے ان دونوں کا خون کر کے تمہاری گینگ میں شامل ہو جاؤں گا۔"

اس بیچارے نے دن رات کر کے درشن سنگھ اور ساوتری کو ڈھونڈھ نکالا میں ساوتری سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ اس بیوفائی کے بعد بھی میں اس سے شادی

کے لئے تیّار تھا۔ مگر وہ دونوں کسی طرح بھی ایک دوسرے کو چھوڑنے کے لئے تیّار نہ ہوئے۔ آخر میں مَیں نے اپنی بندوق اٹھالی مگر ـــــ نگران تصویروں سے ہار گیا کبھی کبھی آدمی چھوٹی چھوٹی چیزوں سے ہار جاتا ہے۔"

"مگر تم تو سپاہی ہو اور سپاہی کے لئے بندوق چلانا کیا مشکل ہے۔"

"سپاہی صرف دشمن پر بندوق چلا سکتا ہے اور وہ لوگ میرے دشمن نہ تھے۔ وہ لوگ ـــــ وہ دونوں ایک دوسرے کی محبّت میں اتنے ڈوبے ہوئے تھے کہ ان کے سامنے کوئی تیسرا نہ تھا۔ نہ دوست نہ دشمن۔ میں خود ان کی نگاہوں میں مکمّل اجنبی تھا۔ اتنا اجنبی جتنا کسی ویران سنسان جگہ پر اُگا ہوا کوئی اجنبی پیڑ۔ پتہ نہیں میں کیا کہہ رہا ہوں۔؟"

"جو تم کہہ رہے ہو۔ وہ میں سب سمجھ رہا ہوں۔"

"سنو۔" یکایک وہ رک گیا۔ اور مجھے پکڑ کر اس نے روک دیا۔

"سنو۔" وہ چلا کر بولا۔ "ایک سپاہی ایک مکمل اجنبی پر کیسے گولی چلا سکتا ہے۔ شان سنگھ مجھ پر ہنس رہا تھا۔ مگر میں اسے گولی سے اڑا سکتا تھا۔ مگر وہ میرے بچپن کا دوست ہے۔ اس نے مجھ سے بڑی حقارت سے کہا۔ تم ڈاکو بننے کے لائق نہیں ہو مگر میں جانتا ہوں۔ میں بزدل نہیں ہوں۔ بدقسمت ضرور ہوں۔"

میں نے پوچھا۔ "اب تم کیا کرو گے۔؟"

وہ بولا ـــــ "سپاہی ہوں۔ واپس اپنی رجمنٹ میں چلا جاؤں گا۔ اور اگلی لڑائی میں تم کبھی پڑھ لو گے۔ صوبیدار میجر رونق سنگھ فرنٹ پر بہادری

سے لڑتا ہوا مارا گیا۔"

وہ ایک تلخ طنزیہ ہنسی ہنسا۔ حالانکہ اس ہنسی میں مجھے آنسو نظر آئے۔ مگر میں نے بات کا رخ پلٹنے کی خاطر اس سے کہا ــــــ "نہیں تم زندہ رہو گے اور پھر محبت کرو گے۔"

وہ بولا۔ "محبت تو بس ایک دفعہ ہوتی ہے۔ باقی تو سب سمجھوتے ہوتے ہیں۔"

باقی راستہ ہم نے خاموشی سے طے کیا۔ وہ شاید اب میرے قریب سے جا چکا تھا۔ وہ میرے ساتھ نہیں چل رہا تھا۔ وہ وہاں موجود نہ تھا۔ کبھی کبھی آدمی ہوتے ہوئے موجود نہیں ہوتا ہے۔ اور قدم اٹھاتے ہوئے غائب رہتا ہے اور سانس کی آمد و رفت کے باوجود زندگی سے آگے بڑھ جاتا ہے۔

اب میں نے اس سے بات کرنا مناسب نہ سمجھا کیونکہ وہ وہاں موجود نہ تھا۔

●

○
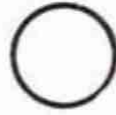
مَیں نے لگیج آفس میں اپنا سوٹ کیس کھولا۔ کپڑوں کی تہوں کے نیچے ایک بھورے رنگ کا لفافہ رکھا تھا۔ اس میں تیس ہزار روپے تھے۔ وہ لفافہ موڑ کر جیب میں رکھا۔ سوٹ کیس بند کیا۔ لگیج آفس کے کلرک کو پانچ روپے کا نوٹ دیکر ہدایت کی۔ ممکن ہے مجھے واپس آنے میں کئی دن لگ جائیں، اسے میرے سوٹ کیس کو ذرا سنبھال کے رکھنا ہوگا۔ اس نے احتیاط کا وعدہ کیا۔ چہرے پر پانچ روپے والی مسکراہٹ تھی۔

پھر میں واپس چلا۔ رونق سنگھ کی مہربانی سے مجھے واپس جانے کا راستہ تو معلوم ہو چکا تھا۔ پھر ایک دن شپارا میں رہنے سے مجھے یہ احساس بھی ہو چلا تھا۔ جیسے کوئی میرا پیچھا کر رہا ہے۔ میں نے کسی کو دیکھا تو نہیں لیکن ایک سائے کی طرح یا چھلاوے کی طرح اس کا احساس رہا۔

واپس جنگل میں پہونچکر میَں اٹکل سے ایک طرف چلنے لگا۔ مشکل سے سو گز

اندر چلا گیا تھا کہ قدموں کی چاپ محسوس کی۔ مڑ کر دیکھتا ہوں تو ایک ڈاکو اسٹین گن ہاتھ میں لئے میرے ساتھ ساتھ چل رہا ہے۔ گمان یقین میں بدل گیا۔ ضرور کسی نے میرا پیچھا کیا ہے۔

وہ ڈاکو میرے ساتھ ساتھ چلتا رہا مگر کچھ بولا نہیں۔ راستہ میں اگر میں کہیں بھٹک جاتا تو وہ فوراً ہی آگے چل کر میری رہنمائی کر دیتا۔ کچھ دور جانے کے بعد اس نے مجھ سے کہا ـــــ "اب یہاں سے تمہاری آنکھ پر پٹی بندھے گی۔" میں نے انکار نہیں کیا۔ اس نے میری آنکھوں پر پٹی باندھ دی اور میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ باقی راستہ اسی طرح ہم دونوں نے طے کیا۔ بس مجھے اتنا یاد ہے کہ جب پٹی کھلی، میں شان سنگھ کے سامنے تھا۔

"رقم لائے ہو۔" شان سنگھ نے مجھ سے پوچھا۔

میں نے پچیس ہزار کے نوٹ اسے گن کر دیئے۔ جب اس کی تشفی ہو گئی تو اس نے میرے ساتھ آنیوالے ڈاکو سے کہا۔ "ریکھا کو رہا کر کے اس کے حوالے کر دو۔ اور ان دونوں کو احتیاط اور حفاظت سے جنگل کی آخری حد تک پہنچا کر آؤ۔"

⁂ ⁂ ⁂

ڈاکو واپس چلے گئے تھے اور اب ہم دونوں اکیلے ایک پہاڑی پگڈنڈی پر چل رہے تھے۔ راستہ بھر ریکھا نے مجھ سے کوئی بات نہیں کی تھی۔ جب ڈاکو چلے گئے تو میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ وہ کچھ نہیں بولی۔ میرے

ساتھ چلتی رہی۔ ایسا لگتا تھا۔ جیسے کسی گہری سوچ میں ہے۔ اس کے ہاتھ کے لمس سے معلوم ہوتا تھا کہ اس میں کوئی جوابی رَو نہیں ہے۔ جیسے کچھ عرصہ کے لئے اس نے جذبے کو واپس کھینچ لیا تھا۔ بس ایک بے جان سا ہاتھ تھا۔ جو میری مٹھی میں تھا۔!

ایک پتلی سی ندی۔ چھوٹے چھوٹے پتھروں اور کنکروں پر بہنے والی۔ سُست رفتار ندی کو پار کر کے ہم نے کھانا کھایا۔ پانی پیا۔ وہ دیر تک ندی کنارے ہاتھ منہ دھوتی رہی اور آنکھوں پر چھینٹے مارتی رہی جیسے آنکھوں کے آگے کوئی غبار چھا گیا ہو۔ جیسے وہ دھونے کی کوشش کر رہی ہو۔

میں نے اس سے کچھ نہیں کہا۔ ندی کے قریب ایک ٹیلے پر املتاس کا ایک درخت کھڑا تھا۔ اس کی چھاؤں میں آکر لیٹ گیا۔

تھوڑی دیر کے بعد وہ بھی آئی اور میرے قریب آکر بیٹھ گئی۔ پھر اس نے اپنا سر میرے سینے پر رکھ دیا۔

میں اس کے بالوں سے کھیلنے لگا۔

تھوڑی دیر کے بعد اس نے گھٹے گھٹے لہجہ میں کہا۔

"مجھے اپنی باہنوں میں سمیٹ لو۔"

٭ ٭ ٭

پہاڑی سلسلہ ختم ہو چکا تھا اور گھنا جنگل بھی۔ اب ہم اونچے اونچے

ٹیلوں کی وادی میں تھے جو خشک خار دار جھاڑیوں سے پٹی پڑی تھی۔ کہیں کہیں چھوٹے چھوٹے ریگزاروں میں اونٹ کے قدموں کے نشان دکھائی دے جاتے۔

ریکھا بولی ——— "اونٹوں کا راستہ آگیا۔ اب راستہ میں کوئی اونٹ والا مل گیا تو میں اس کے ساتھ گھر چلی جاؤں گی۔"

کیا یہ راستہ جیر آباد کو جاتا ہے۔؟" میں نے اس سے پوچھا۔

اس نے انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "جیر آباد ابھی دور ہے۔ اس رتیلے علاقہ کو پار کر کے وہ چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں والا جنگل آئے گا۔ وہ دیکھتے ہو نا۔"

"ہاں۔!"

اس کو پار کر کے دوسری طرف کی وادی میں جیر آباد کا قصبہ ہے۔ مگر میں تمہیں وہاں تک نہ لے جاؤں گی۔ کسی اونٹ والے کے ساتھ چلی جاؤں گی۔ کوئی اونٹ والا نہ ملا تو میں اکیلی ہی چلی جاؤں گی۔ پہاڑوں کے اُدھر تو میری اپنی وادی ہے۔ وہاں کوئی خطرہ نہیں ہے۔ پھر گھر بھی قریب ہے۔ خطرے کی کوئی بات نہیں ہے۔"

میں نے کہا۔ "نہیں۔ میں تمہیں قصبہ کے باہر تک چھوڑ آؤں گا۔"

"نہیں، نہیں۔" وہ گھبرا کر بولی۔ "ممکن ہے وہ باہر کھیتوں تک آیا ہو۔ میرے ساتھ وہاں تک نہ جانا۔ وہ تمہیں مار ڈالے گا۔ بڑا ظالم ہے۔ سارے علاقہ کے لوگ اس سے تھر تھر کانپتے ہیں۔"

" نہیں میں ساتھ چلوں گا۔" میں نے بڑی سختی سے کہا۔

وہ آبدیدہ ہو کر بولی۔ "نہیں، میری عزّت کا سوال ہے۔"

مجھے یاد آیا۔ دو گھنٹے پہلے اس ندی کے کنارے وہ میری باہوں میں سمٹ آئی تھی۔ اور میں نے اسے اپنی باہوں میں لے کر اپنا گال اس کے گال پر رکھ دیا تھا۔ پھر میرے ہونٹ اس کے ہونٹوں میں گھل گئے تھے۔ اور جب میرے بیقرار ہاتھ اس کے سینے کو چھونے لگے اور اس کی کرتی کے بٹن کھولے گئے تو اس نے ایک دم میرے ہاتھوں کو پرے کر کے سسکتے ہوئے لہجہ میں کہا تھا۔

"بابو مجھے کلنک مت لگانا۔"

اور میں نے اسے چھوڑ دیا تھا کیونکہ میں اس کی کشمکش سمجھ چکا تھا۔ اور میں چاہتا تھا کہ وہ خود ہی میری باہوں کی گرفت سے آزاد ہو کر کوئی فیصلہ کرے۔ پھر بھی میں نے اس سے کہا تھا۔

"کیا تم محبّت کو کلنک سمجھتی ہو۔؟"

اس کی کرتی کا ایک بٹن کھل گیا تھا۔ اور اس کے سینے کے اُبھار نو گرفتار طائر کی طرح چولی میں مچل رہے تھے۔ میری نگاہوں کا رخ دیکھ کر اس نے جلدی سے اپنی اوڑھنی سینے پر لے لی۔ اور بولی۔ "چلو دیر ہو رہی ہے۔"

راستہ بھر عجیب سی بے چینی رہی۔ اَدھ کہی باتیں۔ اَدھ سنے نغمے۔ نامکمّل بین ٹوٹتی تصویریں۔ ریزہ ریزہ جذبے۔ جانے زندگی کیسے خطرناک موڑ پر آپہونچی ہے۔ کچھ معلوم نہیں ہوتا۔ یہ سفر کدھر لے جائے گا۔ یہ لڑکی کیا چاہتی ہے۔ اس کی زندگی کے دھارے کا رخ کدھر ہے۔ کیا میں اس دھارے میں بہہ کر پار اُتر

جاؤں گا۔؟ یا منجدھار میں ڈوب جاؤں گا۔ ریکھا اب میری زندگی کی ریکھا بن چکی تھی۔

ٹیلوں والے ریگزاروں میں گھومتے راستہ پر کوئی اونٹنی سوار نہ ملا اور گلہریاں۔ سٹلے۔ سانپ، جنگلی خرگوش تو ملے مگر اونٹ والا کوئی نہ ملا۔ اور ہم تپتے راستہ پر سفر کرتے رہے۔ پھر پہاڑی سلسلہ شروع ہو گیا اور درختوں کے گھنے سایوں میں گرمی سے کسی قدر نجات ملی۔ کوئی ایک گھنٹہ سفر کرنے کے بعد ایک دوراہا ملا۔ ایک راستہ میدانی علاقے کو جاتا تھا۔ جہاں دُور تک چھوٹی لائن کی پٹڑی چمک رہی تھی۔ دوسرا راستہ ایک اونچی پہاڑی کے اوپر سے ہو کر جاتا ہے۔

یہاں آکر ریکھا رک گئی۔ بولی ——— "اب میں یہاں سے اکیلی جاؤں گی۔"

"کیوں۔"

"یہاں سے گھر بہت قریب ہے۔"

"وہ کیسے۔؟"

"وہ موڑ کاٹ کر میں اس پہاڑی کے اوپر پہونچ جاؤں گی۔ دوسری طرف کھلی وادی ہے۔ اور جیرآباد کا قصبہ۔ بس تم یہاں تک آسکتے ہو۔ اس کے آگے نہیں۔ تمہارا راستہ یہ میدانی علاقہ کا راستہ ہے۔ سیدھا شپارا کو جاتا ہے۔ میں اپنے راستہ پر جاؤں گی، تم اپنے راستہ پر۔ وعدہ کرو۔" اس نے مجھ سے لپٹتے ہوئے کہا۔

"وعدہ تو کرتا ہوں مگر میرا کیا ہوگا۔؟"

وہ بولی۔ "تم شپار اسے سیدھے میری اماں کے گھر چلے جانا۔ میں تین دن کے بعد واپس آجاؤں گی۔ پھر تم جہاں کہو گے تمہارے ساتھ چلی جاؤں گی۔"

میرے دل میں خوشی کی ایک لہر اٹھی ــــــ اور رگ رگ میں سما گئی۔

"سچ کہتی ہو۔؟"

"ہاں۔" وہ ہانپتی ہوئی بولی۔

میں نے اسے گلے سے لگا لیا۔ دیر تک ہم ایک دوسرے سے لپٹے ہوئے ایک دوسرے کے ہونٹوں میں رہے۔ پھر بدقت تمام وہ مجھ سے الگ ہو کر بولی۔

"اچھا اب جاؤ ــــــ جاؤ۔!"

"پہلے تم جاؤ۔"

اس نے بڑی مشکل سے اپنا ہاتھ مجھ سے چھڑایا اور اپنے راستہ پر چلی۔ ڈگمگاتی ہوئی چلی۔ میں نے دوڑ کر اسے پیچھے سے جا لیا۔ اور اسے اپنی باہوں میں اٹھا لیا ــــــ اور بھینچ لیا۔

وہ رندھے ہوئے گلے سے بولی۔ "اب کیا مار ہی ڈالو گے دم رک رہا ہے۔"

یکایک میری گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ میں نے بڑی مشکل سے اسے اپنے آپ سے الگ کیا اور اس سے منہ پھیر کر بولا۔

"تمہیں دیکھتا رہوں گا تو پھر دوڑ کر اٹھا لوں گا۔ اس لئے میں منہ پھیر کر کھڑا رہتا ہوں۔ تم جلدی سے چلی جاؤ۔"

"اچھا۔" وہ ٹھنڈی سانس بھر کر بولی۔

وہ سانس جیسے پھیل کر پہاڑوں، جنگلوں، ریگزاروں، ٹیلوں، ندیوں،

ساری کائنات میں پھیل گئی۔ چند منٹ کے بعد جب میں نے پلٹ کر دیکھا تو ریکھا وہاں سے جا چکی تھی۔ صرف اس کی ٹھنڈی سانس میرے چاروں طرف پھیل پھیل کر مجھ سے لپٹتی جا رہی تھی، جیسے ریکھا کائنات میں گھل کر ٹھنڈی ٹھنڈی سانسیں لے رہی ہو۔

"ریکھا۔" میں ایکدم چلّا اٹھا، مایوسی سے اور اس کے راستہ پر دوڑا۔ دُور تک اس راستہ پر دوڑا مگر وہ مجھے کہیں نظر نہیں آئی۔ دوڑتے دوڑتے پہاڑ کی چوٹی پر چڑھ گیا۔ مگر وہ مجھے کہیں نظر نہیں آئی۔ دوسری طرف کی وادی گھنے جنگلوں اور اونچے نیچے ٹیلوں سے بھری پڑی تھی۔ مگر مجھے نہ ریکھا نظر آئی۔ نہ جیرآباد کا قصبہ اس گھنے جنگل کی اوٹ میں ہو گا۔

میں مایوس ہو کر واپس لوٹا۔ واپس دوراہے پر پہونچ کر اترائی کا راستہ لیا۔ چلتے چلتے راستہ میں ایک اونٹ والا ملا۔ اس سے شپارا جانے کا کرایہ طے کر کے اونٹ پر بیٹھ گیا۔ کچھ ایسا محسوس ہوا کہ اگر کوئی ریت کا ٹیلہ چلنے لگے تو بالکل اونٹ کی چال چلے گا۔ میرے سامنے اونٹ کا کوہان تھا۔ کچھ ایسا لگا جیسے انسان کی ساری زندگی ہی ایک کوہان ہے۔ ٹیڑھی میڑھی پیچیدہ۔ محبت سے بھاگ کر آیا تھا۔ محبت میں گرفتار ہو بیٹھا۔ زندگی۔ زندگی تیری کون سی کل سیدھی۔

●

○

شپارا پہونچکر میں ڈو[۲] دن سرائے میں پڑا رہا۔ سوچا وہ تو تیسرے دن آئیگی۔ میں ڈو[۲] دن پہلے سرھبنی جاکر کیا کروں گا۔؟ اس وادی میں جاکر ایک عجیب سی وحشت کا احساس ہوتا تھا۔ جی ڈولنے سا لگتا تھا۔ ٹھیک ہے جس دن ریکھا آئے گی اس دن جاؤں گا۔

ڈو[۲] دن سرائے میں پڑا رہا۔ صبح شام لمبی لمبی سیروں کو نکل جاتا تھا۔ کہ شپارا میں دیکھنے کی کون سی چیز تھی۔؟ ایک بڑا اُبسا پسماندہ سا قصبہ سیکڑوں برس پرانے ماحول میں ڈوبا ہوا۔ اُپلے۔ ننگے بچّے اور خاک میں لوٹتے ہوئے گدھے۔

تیسرے دن ابھی پو پھٹی نہ تھی کہ رات کے تیسرے پہر ہی سرھبنی کی طرف چل پڑا۔ تیسرے پہر کی خنکی میں سفر کرنا آسان رہتا ہے۔ خصوصاً جبکہ پیدل سفر کیا جائے۔ راستہ، پیڑ، چھپر، ٹیلے سب شبنم میں ڈوبے ہوئے اور تاریکی میں دھندلے دھندلے سے، سانس روکے ہوئے دھبّوں کی طرح دکھائی دیتے تھے۔

چلتے چلتے راستہ بھول گیا۔ تیسرے پہر کی نیم تاریکی میں راستہ کچھ ٹھیک سے یاد نہ رہا۔ یہ بھی معلوم نہ ہوا کہ دھولیا گاؤں کب راستہ میں آتا ہے۔ اور کہاں۔ ! دھولیا گاؤں بھی راستہ میں کہیں نظر نہ آیا۔ نہ وہ ندی جو اس دن کسی بپھرے ہوئے جذبے کی طرح چڑھی ہوئی تھی۔

ہاں جب پو پھٹی اور سورج نکلا تو میں نے دیکھا کہ میں سربھنی کے پلاٹو پر ہوں۔ چاروں طرف جھاڑیاں اُگی تھیں۔ کہیں کہیں پر درختوں کے جھنڈ اور پلاٹو سے سربھنی کا پہاڑی سلسلہ دھیرے دھیرے سب یاد آنے لگا۔ راستہ جانا پہچانا معلوم ہونے لگا۔ میں دھیرے دھیرے اٹکل سے ادھر چلتا گیا۔ جدھر درختوں کے ایک گھنے جھنڈ کے اُدھر سروجا دیوی کی حویلی تھی۔

گھنٹہ بھر کے سفر کے بعد میں نے اس گھنے جھنڈ کو پہچان لیا۔ جو اب میری نگاہوں کے افق پر تھا۔ اور جس کے دوسری طرف وہ حویلی تھی۔ وہاں بی سروجا دیوی ہوں گی۔ جانے انہوں نے راوت کی کیا گت بنائی ہوگی۔ نہ جانے راوت نے کیا چال چلی ہوگی۔ سروجا دیوی کا بچتہ مخمور حسن یاد آنے لگا۔ کچھ بھی ہو۔ آج ریکھا اس وادی میں آئے گی۔ گویا میرے دل میں آجائیگی۔ میں آج ہی اسے لیکر اس وادی سے نکل جاؤں گا۔

ریکھا کا خیال آتے ہی میرے دل میں خوشی کی پھریریاں سی آنے لگیں اور میرے قدم خود بخود تیز ہوتے گئے۔

چند منٹ بعد میں اس پیڑوں کے کنج میں تھا۔ جھنڈ پار کرکے جب میں دوسری طرف نکلا تو چند لمحوں کے لئے سکتہ میں رہ گیا۔

وہاں کوئی حویلی نہیں تھی۔

٭ ٭ ٭

آنکھیں مل مل کے دیکھا جس جیتی جاگتی صحیح و ثابت حویلی کو چند دن پہلے چھوڑ کر گیا تھا وہاں اب ایک کھنڈر تھا۔ برسوں پرانا اور شکستہ اور آدھا جلا ہوا۔ آدھی دیواریں ڈھے چکی تھیں۔ اور ان میں جھاڑیاں اگ آئی تھیں۔ ایک دیوار کو توڑ کر وہ پیپل کا ایک بڑا درخت اگ آیا تھا۔ جس کا تنا چند دن میں تو اتنا موٹا نہیں ہو سکتا۔ کیا میں کہیں اور تو نہیں آگیا۔ نہیں ــــــ مگر یہ تو وہی درختوں کا جھنڈ ہے۔ وہی جگہ ہے۔ آس پاس کے ٹیلے۔ ڈھلوانیں وہی ہیں جو میں چند روز پہلے اپنی آنکھوں سے دیکھ کر گیا تھا۔ پھر بھی اپنی تسلّی کی خاطر ادھر ادھر گھومنے لگا۔ دیر تک اس دو منزلہ حویلی کو تلاش کرتا رہا۔ سرمھنی کے پلاٹو میں بہنے والی ندی تو مل گئی۔ ہاں وہی ندی ہے مگر وہ حویلی کہاں چلی گئی۔ وہ کھیت کدھر گئے۔ لگتا تھا برسوں سے اس پلاٹو پر کاشت نہیں ہوئی ہے۔

گھوم گھوم کر پھر اسی چلے ہوئے کھنڈروں میں پہونچا۔ دیر تک سر پکڑ کے بیٹھا رہا۔ مگر یہ گتھی کسی طرح نہ سلجھی۔ پھر وہاں سے اٹھا اور شکار گاہ کی جانب چلدیا۔ مگر جہاں پر شکار گاہ ہونی چاہیے تھی وہاں پر کوئی شکار گاہ نہیں تھی۔ کوئی باغ یا باغیچہ نہ تھا۔ کوئی باؤلی نہیں تھی۔ چاروں طرف ویرانہ۔ جھاڑ جھنکاڑ اور جنگل میرے جسم کے رونگٹے کھڑے ہونے لگے۔ یہ کیا ماجرا ہے۔

دل میں ایک عجیب سی دہشت سی بیٹھنے لگی۔

میں واپس کھنڈروں میں گیا اور وہاں سے سمت کا اندازہ کر کے کواڑی قلعہ کی طرف چل پڑا چلتے چلتے کواڑی قلعے میں پہونچ گیا۔ قلعے کو پہچان کر سکون سا ہوا۔ ہاں تو یہاں تو آیا تھا۔ یہی قلعہ ہے۔ وہی اس کے کھنڈر ہیں مگر جیسے کھنڈر میں نے دیکھے تھے۔ اس سے بہت پرانے اور بہت ہی شکستہ۔ وہ جگہ دیکھی جہاں ریکھا کھڑی تھی۔ مگر وہاں کوئی بیری کا جھاڑ نہ تھا۔ چند سوکھی سڑی جھاڑیاں خشک پتوں کی جٹائیں پھیلائے کھڑی تھیں۔

یکایک میں بے اختیار زور سے چلایا۔ "ریکھا۔ ریکھا۔"

میری آواز قلعہ کی شکستہ فصیلوں سے ٹکرا کر اور گونج کر واپس لوٹ آئی میرا دل بھر آیا۔ پھر ایک گہرے سناٹے میں جیسے کوئی میرے دل میں کہنے "یہاں سے چلے جاؤ۔ چلے جاؤ۔ یہاں کوئی نہیں ہے۔ کوئی نہیں ہے۔"

بس اٹھ کر بھاگا۔ دور تک بھاگتا چلا گیا۔ مجھے کچھ یاد نہ رہا۔ میں کہاں بھاگ رہا ہوں اور کدھر۔؟ کون سی میری منزل ہے۔ اور کدھر کو میرا سفر ہے۔ میں دیر تک بھاگتا رہا۔ دوڑتا رہا۔ چٹانوں سے میرے گھٹنے چھل گئے اور خار دار جھاڑیوں کے کانٹے میرے تلوؤں میں اتر گئے۔ میرا سارا بدن پسینے سے شرابور ہو گیا۔ مگر میں دوڑتا ہی رہا۔

سہ پہر کے بعد میں سرجھنی کے پلاٹو کی اترائی اتر کر اس ندی کے کنارے پہونچ چکا تھا۔ جو میں نے اور ریکھا نے اس خطرناک حالت میں پار کی تھی۔ مگر اب یہ ندی قریباً سوکھی پڑی تھی۔ اور اس کے سوکھے پتھروں میں پانی کی ایک

پتلی دھار بہتی تھی۔
ندی پار کر کے کھجوروں کے ایک گھنے کنج کے پار اُدھر دھولیا گاؤں تھا۔
مگر کدھر تھا وہ دھولیا گاؤں۔
یہاں کوئی چوحدی نہیں تھی۔ کوئی گاؤں نہیں تھا، کوئی زمین کاشت کے قابل نہیں تھی۔ یہاں پر صرف ایک چرواہا تھا۔ جو پیڑوں سے گھری ڈھلوان پر بھیڑ بکریاں چرا رہا تھا۔ بڈھا چرواہا ـــــــ بھک سفید داڑھی، اور گہری اُداس آنکھیں جنہوں نے زندگی کی ہر سلوٹ دیکھی تھی۔ میں نے اس سے کہا۔ "رام رام بابا۔"
"رام رام۔" وہ صدیوں کے سوئے ہوئے لہجہ میں بولا۔ اس کی آواز میں گہرا سکون تھا۔ اور ابدی طمانیت اور وہ اپنی سفید داڑھی اور ہاتھ میں لاٹھی لئے ہوئے چرواہے سے زیادہ کوئی فرشتہ معلوم ہوتا تھا۔
"بابا۔" میں نے پوچھا۔ "ادھر سر بھنی میں ایک دو منزلہ حویلی تھی برجا دیوی کی۔ وہ کیا ہوئی۔؟"
"کب کی بات کرتے ہو۔؟" چرواہے نے میری طرف عجیب نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔
"چند دنوں کی بات ہے۔ میں وہاں ٹھہرا تھا۔"
"پگلے ہوئے ہو۔ وہ حویلی تو ستّر اسّی برس ہوئے ایک رات جل گئی۔ اور اس میں رہنے والے بھی سب جل کر مر گئے۔ ایک بھی نہیں بچا۔ یہ کوئی ستر اسی برس پہلے کی بات ہے۔ جب میں لڑکا سا تھا۔"

کھڑے کھڑے میری ٹانگیں کانپنے لگیں۔ میں سر پکڑ کے زمین پر بیٹھ گیا۔ میری نگاہوں میں زمین و آسمان گھومنے لگے۔

جب میں نے اپنے احساسات پر قابو پالیا تو سورج مغرب میں جا رہا تھا۔ اور وہ چرواہا اپنے ریوڑ کو سمیٹ رہا تھا۔

میں نے بڑی منّت و سماجت کے لہجہ میں اس بڈھے چرواہے سے کہا۔

"بابا، تمہیں کچھ یاد ہے، اس سروجا دیوی کی ایک لڑکی ہوتی تھی۔؟"

"ہاں۔" وہ بڈھا لاٹھی ٹیکتا ہوا بولا۔ "ریکھا اس کا نام تھا۔ وہ اُدھر تمہاری بیٹھک کے پیچھے اس کی سمادھی ہے۔"

"سمادھی۔؟" یکایک میں نے مڑ کر دیکھا اور پوچھا۔

بڈھا میرے ساتھ سمادھی تک گیا۔ بہت پرانی سمادھی تھی۔ شکستہ اور کائی لگی۔ ذرا فاصلے پر برگد کا ایک پیڑ تھا۔ ورنہ اس سمادھی کے دُور دُور تک کوئی جھاڑی تک نہ تھی۔ چاروں طرف ریت اڑتی تھی۔

سمادھی۔؟ جیسے یہ لفظ میرے گلے میں اٹک گیا ہو۔

"ہاں بیٹا۔" وہ بڈھا بڑی افسردگی سے بولا۔

"بڑی خوب صورت لڑکی تھی۔ مگر وہ عین جوانی کے عالم میں ستی ہوگئی۔"

"ستی۔؟"

"ہاں، زبردستی ستی کردی گئی۔ اس کے خاوند کو شُبہ ہوا۔ ریکھا پر کلنک لگنے کا شبہ تھا۔ وہ ڈاکوؤں کے پنجے سے آزاد ہوئی تھی۔ اور جس نے اسے آزاد کرایا تھا۔ وہ کوئی اجنبی تھا۔ جس نے ڈاکوؤں کو پچیس ہزار

روپے دیکر اسے چھڑایا تھا اس لئے اس پر کلنک لگایا گیا۔"

بڈھا چپ ہو گیا۔

"پھر کیا ہوا۔؟"

"ایک رات وہ اپنے پتی کے گھر سے نکل بھاگی۔ اپنے میکے جا رہی تھی کہ اس کے پتی نے اس کا تعاقب کیا اور اسے اس جگہ پر آلیا۔ اور اسی جگہ پر اسے زندہ جلا کر ستی کر دیا گیا۔

"یہ کب کا واقعہ ہے۔؟"

"ہو گئے کوئی ستر اسی برس۔ ان دنوں میں لڑکا سا تھا مگر مجھے سب کچھ یاد ہے۔"

"یہ کیسے ہوا۔؟ یہ کیسے ہوا۔؟" میرا سر چکرانے لگا۔ کیا یہ سب کچھ میرے سامنے نہ ہوا تھا۔ کیا چشم غیب نے مجھے یہ تماشہ دکھایا تھا۔ کیا وقت الٹا بھی بہہ سکتا ہے۔ علم نجوم ہمیں بتایا ہے کہ اگر کوئی راکٹ میں بیٹھ کر روشنی کی رفتار سے اڑے اور اس زمین سے دو ہزار نوری سال کے فاصلے پر چلا جائے تو وہ آج سے دو ہزار سال پہلے کے واقعات دیکھ سکے گا۔ وہ دیکھ سکے گا مسیح کو دار پر چڑھتے۔ وکرمادت کو اپنے نورتنوں کے ساتھ دربار لگاتے۔ کالیداس کو شکنتلا لکھتے۔ کیا یہی سب تو میرے ساتھ نہیں ہوا تھا۔ مگر میں کس راکٹ پر اڑ کر کہاں گیا تھا۔ میں تو اسی زمین پر موجود تھا۔

تو شاید یہ سب کچھ عالم خواب میں مجھ پر گزرا تھا۔ شاید میں چلتے چلتے دم لینے کی خاطر کواڑی قلعہ کی کسی دیوار سے لگ کر سو گیا تھا۔ اور چشم غیب نے مجھے

یہ تماشہ دکھایا۔ شاید انسانی دماغ میں کچھ ایسے خلیئے موجود ہیں جو نہ صرف آنے والے مستقبل کو پکڑ سکتے ہیں بلکہ گزرے ہوئے واقعات کی ذہنی تصویر بھی اتار سکتے ہیں۔ شاید جو کچھ گزرتا ہے وہ مرتا نہیں ہے۔ ہمارے آس پاس دھندلے دھندلے نقوش کی صورت میں، خواب جیسی لطیف حالت میں موجود رہتا ہے۔ وہ واقعات ابھی بھی خلا میں گھوم رہے ہیں۔ وہ تصویریں ابھی بھی کہیں چل رہی ہیں۔ وہ آوازیں ابھی بھی فضا میں بکھری چکر لگا رہی ہیں۔ شاید کوئی چھٹی حس رکھنے والا احساس دماغ کا اینٹینا ٹی وی کی لہروں کی طرح انہیں گرفت میں لے کر دماغ کی سکرین پر لا سکتا ہے۔

ہائے مگر میں کیسے مانوں۔ ابھی تک میری باہنوں میں اس کے بدن کا لوچ میرے سانس میں اس کے سانس کی گرمی اور میرے ہونٹوں پر اس کے ہونٹوں کا شہد باقی ہے۔

میں دیوانہ وار اس کی سمادھی سے لپٹ گیا۔ اور چلّا چلّا کر اسے بلانے لگا۔

"ریکھا ـــــ ریکھا ـــــ ریکھا۔!"

"آنسو میری آنکھوں سے اُبل پڑے اور میری مضطرب باہنیں اس کی سمادھی کو ٹٹولنے لگیں۔

بڈھے چرواہے نے میرے سر پہ ہاتھ رکھا اور بڑی شفقت سے بولا۔

"بٹیا۔ اٹھو۔ چلو۔ رات کو یہاں کوئی نہیں رہتا ہے۔"

میں آنسو پونچھ کر اٹھ بیٹھا۔ سورج افق کے آخری دہانے پر تھا۔ یکا یک شفق کی سرخ کرنوں میں سمادھی کا رنگ لال ہو گیا۔ اور مجھے ایسا محسوس ہوا

جیسے ریکھا کی چتا پھر سے جل رہی ہے۔
پھر سورج ڈوب گیا۔ ہوا کا ایک مرغولہ آیا اور سمادھی پر ریت ہی ریت بکھیرتا چلا گیا۔
"چلو اب یہاں سے، چلو، رات آنے والی ہے۔ رات کو یہاں کوئی نہیں رہتا ہے۔"
میں نے آخری بار ایک حسرت ناک نگاہ ریکھا کی سمادھی پر ڈالی اور اس بڈھے کے ساتھ چل پڑا۔ بار بار مڑ کر دیکھتا جاتا تھا۔ حتیٰ کہ وہ سمادھی بھی ایک موڑ پر آ کر میری نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

٭ ٭ ٭

شاید چشم غیب نے مجھے بتایا تھا کہ شہروں سے جنگل کی طرف بھاگ نکلنے سے بھی زندگی کے مسائل حل نہیں ہوتے۔ جنگلوں کی چھوٹی چھوٹی آبادیوں میں بھی زندگی کے وہی پرابلم ہیں۔ وہی سازشیں، خون۔ قتل۔ غارت گری۔ دولت اور زمین کا لالچ۔ محبت اور نفرت۔ زندگی۔ ہر جہت سے جیتی ہے اس سے فرار ممکن نہیں ہے۔ یہ ممکن ہے کہ تجھے جنگل میں کوئی انسان نہ ملے۔ ایک بھالو تو ملے گا۔ اور بھالو کی بھی اپنی ایک زندگی ہوتی ہے۔ انہیں سمجھے بغیر تو جنگل میں بھی زندہ نہیں رہ سکتا۔ زندگی ہر آن تیرا پیچھا کرے گی۔ تو زندگی سے بھاگ کر کہیں نہیں جا سکتا۔

٭ ٭ ٭

اس لئے میں نے شپارا جنکشن پہونچکر کلکتہ کا ٹکٹ کٹا لیا۔ اور آبھا سے ملنے کے لئے روانہ ہوگیا۔

ختم شُد

●